# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | ابتدا تیرے نام سے | صائمہ اسما | 6 |
| انوارِ ربانی | نفس کا تزکیہ | فوزیہ سعید | 8 |
| قولِ نبیؐ | نماز کیا سکھاتی ہے | فریدہ خالد | 10 |
| خاص مضمون | موافقاتِ حضرت عمر بن خطابؓ | رضیہ خان | 14 |
| گزرا ہوا زمانہ | حضرت صفیہؓ بنت عبد المطلب | خدیجہ نوید عثمانی | 17 |
| نوائے شوق | نعت | نجمہ یاسمین یوسف | 22 |
| | غزل | شاہدہ سحؔر | 22 |
| | مجھے ارزاں نہیں جانو | شمیم فاطمہ | 23 |
| | پاک نگر کے پیارے لوگو! | ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا | 24 |
| حقیقت و افسانہ | مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو | ربیعہ ندرت | 25 |
| | کالی چادر | عظمیٰ ابو نصر صدیقی | 28 |
| | روشنی | قمر پرویز | 31 |
| | مری داستانِ حسرت | فرحی نعیم | 33 |
| انتخاب | دستک | یونس جاوید | 36 |
| سلسلہ وار کہانی | شکست کے رتھ پر سوار | نصرت یوسف | 39 |
| مطالعہ گاہ | میری لائبریری سے | ڈاکٹر آسیہ شبیر منصوری/رفعت اشتیاق | 50/52 |
| ملاقات | محترمہ عذرا سرفراز سجاد سے ایک ملاقات | آسیہ راشد | 55 |
| سیر و سیاحت | امریکی تہوار | آمنہ بلوچ | 62 |
| خفتگانِ خاک | مردِ حق گو | حمیرا خالد | 66 |
| محشرِ خیال | خورشید بیگم | | 72 |
| | رفعت اشتیاق جدا ہو گئیں | خورشید بیگم | 74 |
| زندگی کا فن | سوشل میڈیا کا بے قابو جن | افشاں نوید | 76 |
| نہاں خانۂ دل | سودا | امیمہ امجد | 78 |
| گوشۂ تسنیم | بے سرو سامان | ڈاکٹر بشریٰ تسنیم | 80 |

# ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! اللہ کرے آپ سب اپنے متعلقین سمیت بخیر و عافیت ہوں۔ یہ عافیت بھی کیسا اضافی لفظ ہے! کبھی ہنگامۂ دوراں میں جان بچا لینا عافیت ہے تو کبھی تلخیِ روز و شب میں خواب بچا لے جانا۔ کبھی متاعِ حبیب و داماں خیر کا عنوان ہے تو کبھی متاعِ دل و نظر۔ انہی سے زندگی عبارت ہے۔ بقول ایوبؔ خاور

تم اپنی آنکھیں بچا کے رکھو
ابھی بہت سے عذاب باقی ہیں
خواب باقی ہیں
لفظ و معنی کی حد سے باہر گلاب
موسم کی برفباری نے ڈس لیے ہیں
تم اپنی آنکھیں بچا کے رکھو
کہ آنے والا ہر ایک لمحہ
قیامتوں کا سفیر ہو گا
تم اپنی آنکھیں بچا کے رکھو
یہ خواب ہی اپنی زندگی ہیں

گزشتہ دنوں یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ طالبان سے مذاکرات کا عمل قوم کے سامنے ایک اتمام حجت اور دکھاوا تھا یا اس میں کوئی خلوصِ نیت کی رمق بھی شامل تھی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اس عمل کے رسمی اختتام سے پہلے ہی وزیرستان پر ہوائی حملہ کر ڈالا گیا۔ بظاہر ایف سی کے اہلکاروں کا افغانستان میں بہیمانہ قتل اس کی وجہ بنا، مگر طالبان کی مقرر کردہ کمیٹی نے ڈیڈ لاک کی ذمہ داری حکومت پر ڈالی ہے۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اگرچہ مذاکرات کے دوران

پاکستان میں دہشت گرد کارروائیاں نہیں رکیں مگر اس سے پہلے حکیم اللہ محسود کو بھی دورانِ مذاکرات ہی نشانہ بنایا گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح پاکستان کے خلاف صف آرا جنگجوؤں میں ایسے عناصر موجود ہیں جو امن کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے پر کمر بستہ ہیں، اسی طرح حکومتی صفوں میں بھی دشمن کے ایسے ایجنٹ موجود ہیں جو مذاکراتی عمل کے ذریعے مسئلے کا حل نہیں چاہتے اور حسبِ سابق بلا امتیاز فوجی حملوں کے ذریعے معصوم جانوں کو شکار بنانا چاہتے ہیں تاکہ انتقام کی آگ پھیلتی جائے۔ یہ نسلاً جنگجو قبائل ہیں اور گزشتہ دس سالوں سے ان حالات میں رہ رہے ہیں۔ فاٹا کے شہری دہشت گردوں، امریکی ڈرونز اور پاکستانی فوج تینوں کے حملوں کا یکساں نشانہ بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان سے امن کی توقع رکھنا عبث ہے۔

پاک فوج کی حمایت میں ایم کیو ایم کا ریلی نکالنا بھی ایک طرفہ تماشا ہے۔ بہت سے سرکاری اور نیم سرکاری حلقے اشاروں کنایوں میں کراچی میں بدامنی اور دہشت گردی کے ذمہ دار ایم کیو ایم کو قرار دے چکے ہیں۔ اور جب بھی کراچی میں دہشت گردوں کے خلاف سخت کریک ڈاؤن کیا جاتا ہے، خود ایم کیو ایم کی جانب سے اس کو ایم کیو ایم کے خلاف کارروائی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ جماعت جس کا قائد ساری قوم کے سامنے پاکستان توڑنے کا مطالبہ کر چکا ہو، اب فوج کے حق میں نعرے بازی کر کے کون سے سیاسی فائدے سمیٹنا چاہتی ہے؟

ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سرمائے سے فروغ پانے والا ویلنٹائن ڈے کا کاروبار ہمارے معاشرے کا اخلاقی دیوالہ نکالنے کی مہم ہے۔ ایک ایسا تہوار جو کسی کلچر کی بنیادی اقدار سے ہی متصادم ہو، کس طرح اس کلچر میں رہنے والوں کو خوشیاں دینے کا سبب بن سکتا ہے۔ ہمارے ماحول میں کسی کی بہنوں، بیٹیوں پر بُری نظر ڈالنا بدچلنی اور آوارگی سمجھا جاتا ہے اور نکاح کے بغیر جنس مخالف کی دوستی کو بے رہروی کہا جاتا ہے۔ اگر محبت کے نام پر اس آوارگی اور بے رہروی کو قابلِ قبول بلکہ تفریح کا سبب بنانے کی کوشش کی جائے گی تو یہ ایک غیر فطری عمل ہوگا۔ ایسے غیر فطری کاموں کے نتائج ہمیشہ تصادم اور فتنے کی شکل میں سامنے آتے ہیں، شدت پسندی بڑھتی ہے اور قوم تقسیم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بار بعض جگہوں پر تعلیمی اداروں میں تصادم کی صورتحال پیدا ہوئی۔ ایسے تہواروں کو رواج دینے کی کوشش پاکستان میں امن وامان مزید خراب کرنے کا باعث بنے گی۔

پاکستان کو اس وقت صرف مذہبی انتہا پسندی نہیں بلکہ لبرل انتہا پسندی کا بھی سامنا ہے۔ اگر ایک فحاشی کا اڈہ رکوانے کی کوشش جامعہ حفصہ کا اتنا بڑا جرم بن گئی تھی کہ فوجی آپریشن کے ذریعے قتلِ عام سے کم اس کی کوئی سزا نہ تھی، تو پھر سرمائے اور میڈیا کے زور پر زبردستی پاکستان میں خلافِ آئین فحاشی پھیلانے والوں کی کیا سزا ہونی چاہیے، ذرا حکومت اس پر بھی غور کرے۔ ایک ٹی وی چینل کی رپورٹ کے مطابق ویلنٹائن ڈے پر ہوٹلوں کے سستے پیکجز کی آفر کے پیچھے وہ مافیا کام کر رہا ہے جو بعدازاں بن بیاہے جوڑوں کی خفیہ ویڈیو بنا کر پورنو سائٹس کے ہاتھ کروڑوں میں فروخت کرتا ہے اور اس سال 400 کے قریب جوڑوں کی ویڈیو کو ایسی سائٹس پر بیچا گیا ہے۔ میڈیا کی زبردست ترغیب، سستے فون پیکجز اور ہوٹلوں کی سپیشل آفرز کے طفیل ایسی غلطیاں نوجوانوں خصوصاً لڑکیوں کے لئے عمر بھر کا روگ بن جاتی ہیں۔

ایک خبر کے مطابق انسانی حقوق کی ایک تنظیم نے رپورٹ شائع کی ہے جس میں روہنگیا مسلم آبادی کے خلاف میانمار کی حکومت کی ایسی متعصّبانہ اور ظالمانہ پالیسیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو گزشتہ کئی دہائیوں سے جاری ہیں۔ روہنگیا مسلمانوں کے قتلِ عام کے بارے میں اگرچہ پاکستانی میڈیا مسلسل مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے مگر سوشل میڈیا نے بڑی حد تک صورتحال سے دنیا کو آگاہ رکھا ہے۔ میانمار میں ان بے بس مسلمانوں پر آج بھی زندگی تنگ ہے اور اقوام متحدہ ان کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ ظلم وتشدد کا شکار اقلیتوں میں شمار کر چکی ہے۔ بدھ مت جیسے امن اور عدم جارحیت کے داعی مذہب کے نام لیواؤں نے جو شرمناک اور انسانیت سوز طرزِ عمل روا رکھا ہے، اس کی مذمت کرنے کے باوجود مسلم ممالک اس کو روکنے کے لئے کوئی لائحہ عمل وضع نہیں کر سکے۔ وہ تنظیمیں اور ادارے قابلِ داد ہیں جو اپنی اپنی سطح پر حقائق کو سامنے لانے میں مصروف ہیں اور امت کے اجتماعی ضمیر کی بیداری کے لئے مقدور بھر کوشاں ہیں۔

بشرطِ زندگی اگلے ماہ تک کے لئے اجازت۔

طالبہ دعا

صائمہ اسماء

# نماز کیا سکھاتی ہے؟

نماز ہم سب پر فرض ہے۔ یہ ہمارے دین کا ستون ہے۔قرآن کریم میں بار ہا نماز قائم کرنے کا حکم ملتا ہے۔ نماز ہماری روزانہ کی عبادت کا ذریعہ اور انسان کے عبد ہونے کا عملی اظہار ہے۔نماز رب اور بندے کے درمیان ایک تعلق ہے۔ایک ایسا تعلق جس میں بندہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہوئے راز و نیاز کرتا ہے۔قرآن میں اللہ تعالیٰ بندوں سے باتیں کرتا ہے جبکہ نماز میں بندہ اپنے رب سے باتیں کرتا ہے۔ مسنون طریقے پر نماز کا جو طریقہ ہمیں سکھایا گیا ہے اس میں بندہ جسمانی حرکت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں ان دونوں یعنی جسمانی حرکت اور ذکر میں ہمارے لیے کیا اسباق ہیں۔

۱۔کھڑا ہونا: عام حالات میں انسان اللہ کے دربار میں سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔نیت کرنے کے فوراً بعد اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے (رفع الیدین) ہوئے اللہ اکبر کہتا ہے اور فوراً دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیتا ہے۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھانا یا ''ہینڈز اپ'' کرنا گویا بندے کی مکمل بے بسی کا اظہار ہے اپنے رب کے سامنے۔اللہ کو سب سے بڑا مانتے ہوئے خود کو سب سے حقیر سمجھتا ہے اور دنیا کی ہر چیز سے منہ موڑ کر، ہر کام کو چھوڑ کر اس دنیا سے اعلانِ برات کرتے ہوئے نہایت اطاعت گزاری کے ساتھ کہ خالی ہاتھ حاضر ہوں۔اب جو میرا رب کہے گا وہی کروں گا۔

دن میں پانچ دفعہ کئی مرتبہ بندہ اللہ کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا ہے۔گویا وہ اس بات کا عملی ثبوت دے رہا ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر کھڑا ہونا پڑا تو صرف اللہ ہی کے لیے کھڑا ہوں گا۔

۲۔جھکنا: بندہ نماز کی ہر رکعت میں جھکتا ہے (رکوع) یہ دراصل مزید عاجزی و انکساری کو ظاہر کرتا ہے۔یعنی اگر نماز میں دن میں کئی مرتبہ جھکا ہے تو نماز کے علاوہ بھی اللہ کے حکم پر جھک سکتا ہے۔ جھکنا تکبر کی نفی کرتا ہے۔تکبر اللہ کو سخت ناپسند ہے۔

۳۔سجدہ: سجدے کی حالت میں انسان اپنی پیشانی کو جو اس کے جسم کا اعلیٰ ترین حصہ ہے۔ جو ہر

سوچ،فکر،خیال اور خواہش کا مرکز ہے اسے خاک آلود کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی ناک کو بھی زمین پر رگڑتا ہے کہ جب تک ناک زمین پر نہ لگے سجدہ مکمل نہیں ہوتا۔ زندگی میں روزمرہ کے کاموں میں یہ واحد موقع ہے کہ انسان اپنی ناک اور سر کو زمین پر ٹکاتا ہے۔ ورنہ ہر وقت اسے اپنی ناک اونچی رکھنے کی فکر ستاتی ہے۔ جس کے لیے وہ غلط کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا مگر اسی ناک کو اللہ کے دربار میں خاک آلود کرتا ہے اور اپنی خوشی اور مرضی سے کرتا ہے۔ سجدے کی حالت بندے کی حد درجہ اطاعت وفرمانبرداری کا سمبل ہے۔ یہ دراصل اس بات کا اظہار ہے کہ اے اللہ میں صرف اور صرف تیرا بندہ ہوں، تیرا غلام ہوں تو کہے تو میں ناک رگڑ سکتا ہوں۔ تیرے ہر حکم پر میرا سر تسلیم خم ہے۔ تیری ہستی کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میری سوچ خیالات وخواہشات سب تیری تابع ہیں۔ میں اگر زندگی میں کسی بھی موقع پر کھڑا ہوں گا، جھکوں گا تو صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لیے۔ اگر تو مجھ سے راضی ہے تو میری خاک آلود پیشانی دنیا کی ہر مخلوق سے افضل ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب کے سب سے قریب ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی ارشاد ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۩ (سورۃ العلق، آیت نمبر ۱۹)

۴۔ بیٹھنا: نماز میں انسان گھٹنے موڑ کر بیٹھتا ہے۔ گویا گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ گویا اپنی شکست اور اللہ کی عظمت مان لیتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ان تمام پوزیشنز میں انسان اپنی حد درجہ اطاعت وفرمانبرداری اور عاجزی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بندہ نماز کے علاوہ بھی اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہے، دنیاوی معاملات میں بھی رب کے آگے جھکا رہتا ہے یا اپنے نفس کو خوش کرنے میں؟

عام حالات میں نماز میں ایک حالت نہیں ہے اور وہ ہے لیٹنے کی۔ لیٹنا سونے کی، آرام طلبی کی علامت ہے۔ اسی لیے نماز میں لٹایا نہیں گیا۔ اس کے علاوہ نماز میں چلنا پھرنا، کھانا پینا، بولنا اور سونا منع ہے۔ کیونکہ یہ تمام کام نفسانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں مثلاً کھانے پینے اور بولنے کی خواہش بڑی شدید ہوتی ہے۔ خاص کر بولنے کی خواہش خواتین میں شدید تر ہوتی ہے۔ لہٰذا بندہ اپنی خواہشات کو ترک کر کے اللہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور پھر کھڑا ہونا بھی عام طرح

نہیں بلکہ Stand Still ہوتا ہے کیونکہ بہت زیادہ ہلنے جلنے سے بھی نماز فاسق ہونے کا خدشہ ہوتا ہے چل پھر کر زندگی کے تمام کام ہوتے ہیں جبکہ نماز میں تو شروع ہی اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ اٹھا کر ہر قسم کے کام سے اعلان برأت کر دیا جاتا ہے۔

دراصل دن میں پانچ مرتبہ مختلف اوقات میں نماز کے ذریعے انسان کی بہترین ٹریننگ کروائی جاتی ہے نفس کو کنٹرول کرنے کی۔ زبردست قسم کا نظم وضبط سکھایا جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو کائنات کی ہر چیز میں یہی نظم وضبط ہے اور اسی لیے یہ کائنات قائم ہے یہاں ہر چیز کسی نہ کسی طرح نماز کی حالت میں ہے۔ مثلاً پہاڑ اور درخت کھڑے ہیں۔ چوپائے جھکے ہوئے ہیں اور بہت سی چیزیں سجدہ ریز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو علامتی طور پر سجدہ ریز بتایا ہے سورۂ الرحمٰن میں ہے۔ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ 6۔ ترجمہ: ''اور ستارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں''۔

آیئے اب ہم اس ''ذکر'' کی طرف آتے ہیں جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں ہمارے لیے کیا اسباق چھپے ہیں۔

ا۔ نیت: نماز کے لیے سب سے پہلے نیت کی جاتی ہے۔ نیت دل کا عمل ہے۔ لہٰذا نماز پڑھنے کی نیت خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اس میں کسی قسم کا دکھاوا یا ریا کاری شامل نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود سورۃ الماعون آیات ۴ سے ۶ میں فرمایا، ترجمہ: ''تو ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔ جو ریا کرتے ہیں۔'' اس کے علاوہ نیت دل کی حضوری کے ساتھ ہو کیونکہ نیت کے فرق سے عمل بدل جاتا ہے۔ مشہور حدیث ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ''عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔'' (صحیح بخاری)

۲۔ تکبیر تحریمہ: نیت کرنے کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے رفع الیدین کرنا ...... بندہ اللہ کی بڑائی کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ سب سے بڑا ہے۔ مگر چند لمحوں کے لیے رک کر سوچیں کہ کیا واقعی اللہ ہماری زندگیوں میں سب سے بڑا ہے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ نہیں کیونکہ ہماری زندگیوں میں تو کہیں ہمارا نفس بڑا ہے اور ہم اس کی اطاعت میں لگے ہوتے ہیں۔ کہیں اولاد، کہیں ماں باپ یا دوسرے رشتہ دار اور دوست احباب، تو کہیں مال اور رسم ورواج اور ہم ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم زبان سے اللہ اکبر

کہنے کے ساتھ اپنی زندگیوں میں بھی اللہ کو سب سے بڑا بنا لیں تو ہماری زندگیاں بدل جائیں اور ہماری نمازیں درست ہو جائیں۔ اگر نماز درست ہو جائے تو پورا دین ہی درست ہو جائے۔

۳۔ سینے پر ہاتھ باندھنے کے بعد کی دعائیں: سنت سے ہمیں کچھ دعائیں ملتی ہیں مگر عام طور پر یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ ''اے اللہ تو پاک ہے اور (ہم) تیری تعریف کے ساتھ (تیری پاکی بیان کرتے ہیں) تیرا نام بڑا ہی بابرکت ہے۔ تیری بزرگی بلند ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔'' اب ایک مرتبہ پھر سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا واقعی ہم اپنی زندگیوں میں بھی صرف اللہ ہی کی تعریف بیان کرتے ہیں یا اپنی تعریف کے خواہش مند ہیں؟ کوئی دینی کام ہو یا دنیاوی کام، عبادات ہوں یا معاملات کیا ہم صرف اپنی تعریف اور اپنے نام کی بلندی کے لیے نہیں کام کرتے اور جب ہماری حسب منشاء تعریف نہ ہو تو اس کام کو پھر بھی جاری رکھتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں؟ ہم تو اگر نیکی کا کوئی کام کریں تو بھی اپنی ذات کو مقدم رکھتے ہیں، ہر وقت اپنے رشتہ داروں اور دوستوں میں ہمیں اپنی ہی شان بڑھانے کی فکر رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور ہم اپنی ذات کو پیچھے ڈال کر صرف اللہ کے احکامات پر عمل کریں تو تمام فسادات، جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔ کوئی ہماری تعریف کرے یا نہ کرے بس ہم اپنے دین کی سربلندی میں جت جائیں تب ہی تو بات بنے گی۔ آزمائش شرط ہے۔

۴۔ تعوذ وتسمیہ: اب شیطان سے پناہ مانگتے ہیں اور اللہ کے نام سے شروع کرتے ہوئے سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں۔

۵۔ سورۃ فاتحہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ ایک بار پھر اس بات کا اعتراف کہ تعریف تو ساری کی ساری صرف اللہ کے لیے ہے جو تمام مخلوقات کا رب ہے۔ بہت مہربان ہے اور رحم کرنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی تمام جہانوں کا رب ہے۔ ذرے کو کمال تک پہنچاتا ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بدلے کے دن کا مالک ہے۔ بدلے کا دن جی ہاں بدلے کا دن۔ آخر آج ہم دنیا میں بھی کتنے دن مناتے ہیں کبھی ماؤں کا دن، کبھی بچوں کا دن، کبھی خواتین کا دن وغیرہ اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آج ''بدلے کا دن'' ہے تو کیسا محسوس ہوگا۔

ہر انسان کے اعمال کے بدلے کا دن، اچھے اعمال ہوں یا برے سب کا بدلہ دیا جائے گا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہر نماز کی ہر آیت میں ہم ''بدلے کے دن'' کو دہراتے تو ہیں لیکن کیا ہم اس دن کی کچھ تیاری بھی کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو ابھی بھی وقت ہے اور جس قدر وقت ہے سب اسی دن کی تیاری اور اچھے بدلے کے حصول میں لگا دیں تا کہ برے بدلے سے بچ سکیں۔ یہ ایسا دن ہے جو ہر ایک انسان کو منانا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ''صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔'' کیا واقعی؟ آیئے اپنی زندگیوں پر نظر دوڑائیں کہ کہیں غیر اللہ تو شامل نہیں ہے؟ کہیں ہم نفس کی عبادت میں لگ کر صبح سوتے ہی رہتے ہیں اور نمازِ فجر رہ جاتی ہے یا بھوک پیاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر رمضان کے روزے ہی نہیں رکھتے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مال و دولت کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہیں اور اللہ کی نافرمانی کے کاموں میں مصروف ہیں؟ یا پھر لوگوں سے اس قدر ڈرتے ہیں کہ کسی غلط رسم کو نبھانے سے انکار نہیں کر سکتے کہ ''لوگ کیا کہیں گے؟'' جب کوئی مشکل آتی ہے تو کیا صرف اللہ کی ذات پر بھروسا کرتے ہیں یا مال و دولت، اولاد، ماں باپ پر؟ ظاہر ہے ہم دوسروں کی مدد ضرور لے سکتے ہیں اور دنیاوی اسباب اختیار کر سکتے ہیں لیکن توکل تو بہرحال ہمیں صرف اللہ پر ہی ہو کہ وہی مشکل میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ہمیں طریقہ بھی سکھا دیا ہے۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۴۵ میں ارشاد ہے۔ **واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ** ''صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو''۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ''ہمیں سیدھے راستے پر چلا''۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ''ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا، جن پر غضب نہیں کیا گیا اور جو گمراہ نہیں ہوئے۔''

ہم ہر رکعت میں یہ دعا تو مانگتے ہیں کہ ہمیں انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کر۔ کیا ہم نے کبھی یہ جانا کہ وہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں اور ان کا طرزِ زندگی کیا رہا ہے؟ اللہ کا انعام ہوا انبیا کرامؑ پر، صحابہ کرامؓ پر، صالحین اور صدیقین پر۔ تو کیا ہم نے کبھی ان کے حالاتِ زندگی جاننے کی کوشش کی تا کہ ہم ان کے راستے پر چل سکیں؟ آیئے آج ہم ان انعام یافتہ

لوگوں کو اپنا رول ماڈل بنائیں۔ ان لوگوں کے راستے پر چلنے سے بچیں جن پر اللہ کا غضب ہوا مثلاً عذاب یافتہ قومیں اور یہود اور ان لوگوں کے راستے سے بھی بچیں جو گمراہ ہوئے مثلاً نصاریٰ جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا بنا دیا اور بھٹک گئے۔ آمین (اے اللہ قبول کر لے)۔

۶۔ تلاوت قرآن: سورۂ فاتحہ کے بعد ہم قرآن کا کچھ حصہ تلاوت کرتے ہیں لہٰذا ہمیں اس قدر قرآن ضرور حفظ ہو کہ ہم بدل بدل کر آیات تلاوت کر سکیں۔ اس طرح نماز میں خشوع بھی پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ رکوع: بندہ رکوع میں جاتا ہے اور سنت کے مطابق دعائیں پڑھ سکتا ہے۔ عام طور پر جو دعا پڑھی جاتی ہے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ ''پاک ہے میرا رب بڑی عظمت والا''۔ جھکے جھکے بندہ اللہ کی تعریف اور عظمت بیان کرتا ہے۔ کھڑے ہوتے ہوئے کہتا ہے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی'' کس قدر اچھا احساس اور اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے سن لی۔ وہ جو ہمارے دلوں کی چھپی باتیں بھی جانتا ہے اس نے ہماری پکار ہماری دعائیں سن لیں۔ اگر ہم کسی دوسرے شخص سے بات کریں اور آگے سے جواب ملے کہ ''مجھے نہیں سنی تمھاری بات'' یا یہ کہ دوسرا ہماری بات سنے ہی نہ تو کس قدر دکھ ہوتا ہے مگر یہاں تو پورے یقین کے ساتھ بات کی جا رہی ہے کہ اللہ نے سن لی۔

۸۔ قومہ: سیدھے کھڑے ہو کر بھی کچھ مسنون دعائیں ہیں جو ہم مانگتے ہیں اور پھر سجدہ میں چلے جاتے ہیں۔

۹۔ سجدہ: سجدے کی بہت سی مسنون دعاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى ''پاک ہے میرا رب بہت بلند ہے''۔ سبحان اللہ نماز کی حالت دیکھیں کہ اپنے جسم کا سب سے اعلیٰ حصہ زمین پر ٹکا کر اپنے بلند رب کی بلندی کا اقرار کر رہا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ بھی سجدے میں مانگی دعائیں قبول کرتا ہے اس نے خود فرمایا وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ''سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو''۔

۱۰۔ درمیانی جلسہ: اب نمازی دو سجدوں کے درمیان میں بیٹھتا ہے اور پھر دعائیں مانگتا ہے۔

۱۱۔ قعدہ (تشہد): تشہد میں بیٹھ کر التحیات پڑھتے ہیں اور دراصل یہ اقرار کرتے ہیں کہ، ترجمہ ''(میری ساری) قولی، بدنی اور مالی عبادت

صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ اے نبی آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت سلامتی اور برکتیں ہوں اور ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلامتی ہو"۔ یعنی ہماری عبادات میں کوئی ریاکاری شامل نہیں ہے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت بھیجتے ہیں کیونکہ آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچانے کے لیے بڑی تکالیف اٹھائیں۔ پھر اپنے لیے اور دوسرے مومنین کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ اس کے بعد کلمہ شہادت میں اللہ کی توحید اور آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں۔ آخری قعدہ میں ہم اس کے بعد درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جس میں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر اور اسی طرح حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل پر رحمت اور برکت کی دعا کرتے ہوئے ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی تعریف اور بزرگی بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے نبی پر درود بھیجنا اور بھجوانا بہت پسند ہے۔ اسی لیے تو سورہ احزاب، آیت ۵۶ میں فرمایا، ترجمہ "اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔" اس کے علاوہ احادیث سے بھی آپؐ پر درود بھیجنے کی بڑی فضیلت پتہ چلتی ہے۔ نماز میں تو آپؐ پر درود بھیجنا ہر نمازی پر لازم کر دیا ہے لیکن ہمیں چاہیے کہ نماز کے بعد بھی درود شریف پڑھتے رہیں اور اس کی برکتوں سے فیض یاب ہوں۔

دعائیں: درود کے بعد کچھ مسنون دعائیں مانگتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر پہلے اپنی دائیں جانب تمام مخلوق پر اللہ کی سلامتی اور رحمت بھیجتے ہیں اور پھر بائیں جانب۔ یہ سلام اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ نمازی کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ ہیں۔ یہ سلام امن کا پیغام دیتا ہے۔

نماز کے بعد کے اذکار: سلام پھیرنے کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اکبر کہتے اور تین مرتبہ استغفراللہ کہتے اور اللہ کی بخشش مانگتے۔ پھر دوسرے اذکار اور دعائیں کرتے۔

اگر ایک بار ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تمام نماز میں ہم اللہ تعالیٰ سے مانگ ہی رہے ہوتے ہیں۔ ذرا سی اس کی تعریف کی اور مانگنا شروع، تو ہم اللہ سے لے ہی رہے ہوتے ہیں اور نماز پڑھنا ہمارے اپنے ہی فائدے میں ہے۔ دوسری بات کہ پوری نماز میں دو اہم باتیں ہیں پہلی یہ کہ اللہ کو بڑا جانتے ہوئے اس کی اطاعت کرنا اور دوسری یہ کہ اس کی بخشش چاہنا اور پھر مزید دعائیں مانگنا جس طرح نماز کی تیاری وضو سے کی

جاتی ہے اسی طرح اختتام بھی آہستہ آہستہ دعاؤں پر ہوتا ہے۔

ہمارے لیے سوچنے کی یہ بات بھی ہے کہ کیا ہم اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنی نمازوں میں اور نمازوں کے درمیانی وقفے میں بھی قائم رکھتے ہیں یا نہیں؟ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نمازوں سے بہترین سیکھنے والا اور بہترین نمازیں ادا کرنے والا بنائے۔

(استفادہ: کیسٹ ڈاکٹر فرحت ہاشمی)

☆☆☆

ڈاکٹر آسیہ شبیر

# تزکیہ نفس اور نبوتِ محمدی ﷺ

نبی اکرمؐ ختم المرسلین تھے۔ آپؐ کے واسطے سے انسانوں کو آسمانی رہنمائی کے جو تکمیلی اسباق ملے، ان میں تعلیم نبوت کا مقصودِ حقیقی تزکیہ ہی کو قرار دیا گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ، کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے بعثت ختم المرسلین ﷺ کے لئے جو دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان میں انہیں میں سے ایک رسول اٹھانا جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ (البقرہ۔۱۲۹) صرف یہی دعا ہے جہاں تزکیہ کو آخر میں ذکر کیا گیا۔ قرآن مجید کی دیگر تین آیات میں جہاں نبی کریم ﷺ کے مقاصد بعثت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں تعلیم کتاب وحکمت موخر کی گئی ہے اور تلاوت آیات اور تزکیہ کے حصول کو مقدم۔ (البقرہ۔۱۵۱، آل عمران، ۱۶۴) اس تقدیم سے واضح ہے کہ تزکیہ وتربیت، کتاب وحکمت کی تعلیم کو اور دیگر علوم نافع کو قلب وذہن میں جا گزیں کرنے اور ان کے مکمل فوائد وثمرات کے حصول کیلئے ناگزیر ہے۔

''نفوس انسانی کو غلط میلانات ورجحانات سے موڑ کر نیکی کے راستے پر ڈالنا اور درجہ کمال تک پہنچنے کے لائق بنانا اگر تزکیہ کا مفہوم ہے تو نبی کریمؐ کی دعوت کا اولین تعارف یہی تھا۔

بخاری نے حضرت ابوذر غفاریؓ تک دعوت اسلام پہنچنے کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ابوذرؓ کو جب نبی کریمؐ کی بعثت کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے بھائی کو پتہ کرنے کیلئے بھیجا ''میرے پاس اس شخص کی خبر لے کر آؤ جو زعم رکھتا ہے کہ وہ نبیؐ ہے اور اس کے پاس آسمان سے خبریں آتی ہیں۔ اس کی بات اچھی طرح سننا پھر مجھے آکر بتانا۔'' ان کے بھائی نے آکر صرف دو جملوں میں نبیؐ کے احوال ذکر کیے ''رایتہٗ یامر بمکارم الاخلاق۔ وکلاماً ماھو الشعر۔ (میں نے انہیں پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے پایا اور وہ کلام شاعری نہیں ہے)''

ابوسفیان قبل از اسلام قیصر کے دربار میں نبی کریمؐ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے طلب

کیے گئے تھے۔ قیصر نے ان سے نبی کریمؐ کے نسب، ان کے پیروکاروں کی دین پر استقامت اور خود نبیؐ کے ذاتی معاملات کے بارے میں سوال کرنے کے بعد پوچھا کہ وہ تمہیں کیا کرنے کو کہتے ہیں (ماذا یامرکم؟) ابوسفیان کا جواب بھی عقائد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفوس کے لائحہ عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یقول۔ اعبدالله وحدہ ولاتشرکو ابہ شیئا واترکو امابقول آباء کم ویأ مرنا بالصلاۃ والصدق العفاف والصلۃ) یعنی وہ کہتے ہیں کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تمہارے باپ دادا جو کہتے ہیں اسے چھوڑ دو اور ہمیں نماز، سچائی، پاکیزگی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ تزکیے کا عمل اصحاب نبیؐ کی زندگیوں میں ظاہر ہوا تو اہل ایمان شکر کے جذبات کے ساتھ اس کا تقابل اپنی سابقہ زندگی سے کرتے تھے۔ حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کا ذکر کرتے ہوئے رہبانیت، تقشّف اور زہد وعبادت گزاری کا نہیں بلکہ ان صفات کا ذکر کیا جو رذائل نفس کو مٹا کر محمدؐ کے پیروکاروں میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس تقریر میں اسلامی اور جاہلی طرز زندگی کا فرق چند جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا "اے بادشاہ! ہم جاہل تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ مردار کھاتے اور بے حیائی کے کام کرتے تھے۔ قطع رحمی کرتے تھے اور ہمسایوں سے برا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے قوی، ضعیف کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جس کے نسب، امانت اور پاک دامنی سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے آباء جن بتوں اور پتھروں کی عبادت کرتے تھے، ان کو چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت کا پاس کرنے، ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے، حرام چیزوں اور خون ریزی سے بچنے کا حکم دیا۔ جھوٹ بولنے، یتیموں کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا اور حکم دیا کہ ایک خدا ہی کی پرستش کرو۔" (ابن ہشام)

تزکیہ نفوس کی اس دولت ہی کی وجہ سے مسلمانوں میں بہادری، شجاعت اور انسانی ہمدردی کے وہ بے پایاں جذبات بیدار ہوئے جن کے بل پر انہوں نے

دیگر انسانوں تک بھی اس دعوت کو پہنچانے کے لیے سارے خطرات مول لیے۔ شاہ ایران یزدگرد کے دربار میں حضرت مغیرہ بن زرارہؓ نے، مسلمانوں کی آمد کا مقصد بیان کیا تھا۔ اخراج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ الواحد القھار۔ یعنی لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ اور واحد وقہار کی بندگی کی طرف لانا۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت جعفرؓ ہی کی طرح اخلاق وکردار کی ان پستیوں کو بیان کیا جن میں وہ اسلام سے پہلے مبتلا تھے اور اس تبدیلی کا ذکر کیا،، جو اسلام قبول کرنے کے بعد ان میں رونما ہوئی۔ (تاریخ طبری) حضرت مغیرہؓ کے اس واقعے سے استدلال کرتے ہوئے مشہور مستشرق، گستادولی بان نے گواہی دی ''کچھ ہی کیوں نہ ہو، حضرت رسالت مآبؐ نے ملک عربستان میں وہ اخلاقی نتائج پیدا کر لیے جو کوئی مذہب قبل از اسلام (اپنے پیروکاروں میں) پیدا نہ کر سکا تھا۔'' (تمدن عرب)

اکثم بن صیفی کے نمائندوں کے سامنے، ان کے سوالات کے جواب میں آپ نے جو دعوت رکھی وہ قرآن مجید کے پیش کردہ تزکیہ کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ آپ نے فرمایا میری دعوت یہ ہے کہ

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی۔ (النحل۔۹) بے شک اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے اور بدی، بے حیائی اور ظلم اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔ (ابن کثیر)

### تزکیہ:...... علمی اور عملی زندگی کی روحِ رواں

مذہبی اور تعلیمی زندگی کی تاریخ میں نبی کریمؐ کا یہ کارنامہ سرفہرست رکھے جانے کے لائق ہے کہ آپؐ نے ایک تو تزکیہ کا وہ جامع مفہوم پہلی مرتبہ انسانوں کے سامنے پیش کیا جس کو ہمیشہ افراط وتفریط میں گم کیا جاتا رہا تھا۔ دوسرے یہ آپؐ نے تزکیہ کے عمل کو زندگی کی روحِ رواں بنا دیا۔

نبی کریمؐ جو ''دین قیم'' لے کر آئے، اس میں تزکیہ نیت، عقیدے، عمل، عبادات، اخلاقیات اور معاملاتِ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ دین اور دنیا کی ساری بھلائیاں بیک وقت مطلوب بھی ہیں اور محمود بھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے سعادتِ انسانی کے تعین کے حوالے سے بحث میں بڑے موثر دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ نظام کائنات ہو یا نظام انسانی، ان دونوں کی بقاء، استحکام اور استمرار کے حوالے

سے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح ادا کرنا اور اس سب مشغولیت کے باوجود زندگی کے روحانی تقاضوں کوفراموش نہ کرنا حتیٰ المقدور اس حوالے سے کوشش اور جدوجہد میں مصروف رہنا، انسان کی حقیقی سعادت ہے اور اس میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے (حجتہ البالغہ)

نبی کریمؐ نے زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے یہی تعلیم عطا فرمائی۔ مثلاً نکاح کو سنت قرار دیا اور یہاں تک فرمایا۔ فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (بخاری) اپنی امت کے لئے یہ نہیں مقرر فرمایا کہ اچھا وہ ہے جو گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جائے، جسم کے ''ناپاک تقاضوں'' کو پورا کرنے کے بجائے ''نجات'' کے حقیقی مقصد کو سامنے رکھے اور رشتہ و پیوند کے کسی ''مایا جال'' میں گرفتار ہو۔ بلکہ فرمایا کہ ''خیرکم خیرکم لاھلیکم، وانا خیرکم لأ ھلی (ترمذی) یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور میں تم سب میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا ہوں۔ گھر اور خاندان کو تعلیم اور تربیت کا اولین مرکز بنایا جہاں ''عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر نگران ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا'' (بخاری) اور باپ کو یوں ذمہ دار بنایا کہ ''کوئی باپ اپنی اولاد کو حسن ادب سے بڑھ کر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا۔'' (مشکوٰۃ) والدین اور اولاد کے ساتھ ساتھ قرابت داروں، ہمسایوں، اہل حاجت، حتیٰ کہ چند گھڑیوں کی مصاحبت جس کے ساتھ ہو جائے، اس کے بھی حقوق مقرر فرمائے گئے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن کو کامیابی کا معیار قرار دیا گیا۔ (حجتہ البالغہ)

قرآن مجید میں نصاریٰ کے رہبانیت اختیار کرنے کے محرک، یعنی خوشنودی رب کی تلاش کو قابل مذمت نہیں ٹھہرایا گیا؛ ''بدعت'' ان کے رہبانی احکام وقوانین ایجاد کرنے کو قرار دیا اور اس کی مذمت کی گئی (الحدید۔۲۷)۔ اپنے سے متصل قبل کی اس امت کے ''افراط'' کے طور طریقوں سے سبق اخذ کرتے ہوئے، نبی کریمؐ نے اپنی امت کو غلو اور تشدد و تعمق کی طرف جانے سے سختی سے روکا۔ فرمایا ''اپنے اوپر سختی نہ کرو اللہ تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے یہی تشدد اختیار کیا تھا تو اللہ نے بھی اسے سخت پکڑا۔ دیکھ لو وہ ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں موجود ہیں۔ (ابوداؤد) قرآن مجید ایک دن میں صرف اتنا

پڑھنے کی اجازت دی کہ تفکر وتدبر ہو سکے اور بار خاطر نہ ہو(ابوداؤد) نماز اور نوافل اتنے ہوں کہ رسی باندھنے اور اس کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑے۔(ابوداؤد) بعض صحابہؓ کے بہت اصرار کے باوجود بار بار نصیحت فرمائی کہ روزے اتنے نہ ہوں کہ نظام جسمانی معطل ہو جائے اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ ہونے لگے۔(بخاری) ایک موقع پر تو یہاں تک فرمایا کہ اگر روزے کی وجہ سے کوئی شخص دوسروں کی خدمت کا محتاج ہو جائے تو وہ لوگ اس سے اجر وثواب میں آگے بڑھ جائیں گے جو انسانی ہمدردی اور خدمت کا کام کریں گے(مسلم)

مالی معاملات میں بھی نبی کریمؐ نے توازن اور اعتدال کو برقرار رکھنے کی ہدایات عطا فرمائیں، اگرچہ صدقہ پر زور بھی دیا۔ حضرت کعب بن مالکؓ مومنین صادقین میں سے تھے جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ پچاس دن بعد جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے نبی کریمؐ کے سامنے اپنا کل صدقہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ سب نہیں، کچھ رکھ کر باقی صدقہ کرو۔(بخاری) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنی بیماری میں سب مال صدقہ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بھی صرف ایک تہائی کی اجازت دی۔(ترمذی) کسب معاش کو ''اللہ کے فضل کی تلاش'' قرار دیا گیا۔(الجمعہ۔۱۰) مال کو ''خیر کہا اور حلال رزق کے لیے کوشش کرنے والے کا درجہ مجاہد فی سبیل اللہ کے برابر بیان فرمایا۔(المزمل۔۳۰) ''تزکیہ'' کی مخصوص اور روایتی دنیا میں یہ خیالات اور اعمال بالکل نئے تھے!

نبی محترمؐ نے جہاد وقتال کو دین کی بلند ترین چوٹی قرار دیا ''ذروۃ سنامہ الجھاد'' (ترمذی) بے تابانہ خواہش کا اظہار فرمایا کہ مجھے پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔(مسلم) حضرت موسیٰؑ کے الفاظ میں، آپؐ نے اپنی امت کو وہ ''آتشیں شریعت'' (بائبل، کتاب استثنار) عطا فرمائی (ایسی شریعت جس میں جہاد وقتال کے احکام بھی شامل ہوں) جس میں رہبانیت، زندگی سے فرار، نیکی اور نیکی کے داعیوں کا معاشرے سے کنارہ کش ہونا اور فساق وفجار کے ہاتھوں میں مملکت اور سلطنت کی زمام کار چھوڑ دینا، ہمیشہ کیلئے مسدود کر دیا گیا۔ آپؐ یہ فرما گئے کہ

الجہاد ماض الی یوم القیامۃ (ابوداؤد) آپؐ امت کی زندگی کا سامان بھی اور سامان رزق بھی جہاد ہی میں رکھا گیا۔ وجعل رزقی تحت ظل رمحی۔(بخاری) جہاد ومزاحمت کا یہ جذبہ باقی نہ رہے تو امتیں تر نوالہ بن جاتی ہیں۔

معاملاتِ زندگی کا کون سا پہلو ہے جو پاکیزگی کی تربیت سے محروم رہ گیا ہے۔ درحقیقت یہ وہ تکمیلی تعلیم تھی جو نبی آخرالزماں کے حوالے سے انسانیت کو عطا کرکے، آسمانی رہنمائی کا باب بند کردیا گیا۔

(جاری ہے)

☆☆☆

رضیہ خان

# موافقات عمر بن خطابؓ

وہ مقامات جن میں وحیِ الٰہی نے حضرت عمرؓ کے اجتہاد سے اتفاق کیا۔

کیا ہی شان ہے کہ حضورؐ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! عمر بن خطابؓ یا عمر بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی کو اسلام کی توفیق عطا فرما۔ پھر یہ توفیق حضرت عمرؓ کے حصے میں آئی اور یہ ایسی توفیق ملی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت ختم کردی گئی، اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔ فرمایا عمرؓ جس راستے پر چلتے ہیں شیطان اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرلیتا ہے۔(احمد، ترمذی، حاکم، راوی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص) سبحان اللہ۔

حقیقت یہ ہے کہ مستند کتب میں کم وبیش 16 واقعات ایسے درج ہیں جن میں قرآن مجید نے عمرؓ بن خطاب کے اجتہاد سے اتفاق کیا۔ یعنی ان مسائل میں قرآن کا فیصلہ وہی تھا جو حضرت عمرؓ کا خیال تھا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ تین باتوں میں میری رائے اللہ کے علم کے موافق ہوگئی۔

ا۔ میں نے کہا یارسولؐ اللہ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر آپ مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنادیں۔ تو آیت نازل ہوئی وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (چنانچہ طواف کرنے والے بعد تکمیل طواف اسی مقام پر دوگانہ نفل ادا کرتے ہیں) (سورۃ بقرہ آیت۔ ۱۲۵)

۲۔ حضرت علیؓ راوی ہیں کہ ایک روز عمر بن خطابؓ یہودیوں کی طرف گئے اور ان سے کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰؑ پر توراۃ نازل کی تھی کیا توراۃ میں حضورﷺ کے بارے میں پیش گوئی ہے؟ یہود نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت عمرؓ نے پوچھا پھر تم ایمان کیوں نہیں لاتے؟ تو یہودیوں نے جواب دیا کہ دراصل بات یہ ہے کہ ہر رسول کے ساتھ اللہ نے ایک فرشتہ ضامن کے طور پر بھیجا ہے اور محمدؐ کا ضامن جبرائیل ہے جو وحی لاتا ہے اور وہ ہمارا دشمن ہے، اگر میکائیل جو ہمارا دوست ہے وحی لاتا تو ہم آپؐ پر ضرور ایمان لاتے۔ تو حضرت عمرؓ نے شہادت دی اور کہا کہ نہ میکائیل ایسا تھا کہ جبرائیل کے دوست سے دشمنی کرتا اور نہ ہی جبرائیل ایسی کوئی دشمنی میکائیل کے دوست کے ساتھ کرسکتا ہے کہ اسی اثناء میں حضورؐ کا

وہاں سے گزر رہوا تو یہودیوں نے کہا دیکھو! ابن خطابؓ تمہارے صاحب آ گئے۔ ابنِ خطاب جلدی سے اٹھے اور آپؐ کی طرف بڑھے۔ عین اسی وقت سید نا عمر فاروق کی موافقت میں حضورؐ پر آیاتِ وحی نازل ہوئی۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (البقرہ 97)

۳۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نے دعا کی کہ یا اللہ! شراب کے بارے میں ہمارے لیے کوئی شافی بیان نازل فرما تو سورۃ بقرہ کی آیت 219 نازل ہوئی۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے: اَلْخَمْرُ خَامِرُ الْعَقْلِ یعنی نشہ تو عقل کو ڈھانپ لیتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو بلا کر یہ آیت سنائی گئی۔

۴۔ پھر حضرت عمرؓ نے استدعا کی یا اللہ شراب کے بارے میں مزید شافی بیان عطا فرما۔ تو رب کریم نے مزید فرمایا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء 43)

۵۔ سہ بار استدعا کی یا رب مزید شافی بیان نازل فرما تو سورۃ المائدہ 90 کی یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ...... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ حضرت عمرؓ کو بلا کر یہ آیت پڑھی گئی تو انہوں نے کہا ہم باز آئے ہم باز آئے۔

۶۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے نبی اکرمؐ سے عرض کیا کہ آپؐ کے گھر میں اچھے اور برے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ آپؐ امہات المومنین کو پردے کا حکم دیں۔ تو حکم نازل ہوا۔ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الاحزاب 53) چہرے کے نقاب کے لیے یہی آیت دلیل سمجھی جاتی ہے۔

اس کے بعد سورۃ احزاب کی آیات نازل ہوئیں کہ مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی چادروں کے پلو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں (الاحزاب۔59) دراصل جب مسلمان خواتین رفع حاجت کے لئے باہر نکلتیں تو کچھ اوباش لونڈے ان سے بیہودہ گفتگو کرتے اور کچھ منافق ایسے بھی جو حضورؐ کے پیچھے بدگوئی کرتے اور ازواج مطہرات پر ناحق الزام لگاتے۔ اس طرح ان کی شرارتوں کا سدِ باب کر دیا گیا۔ پھر یہ حکم آیا کہ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا۔

۷۔حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی۔حضرت عمرؓ بول اٹھے هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ رب کریم نے فوراً تائید ان الفاظ میں کی۔ وَلَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡهُ قُلۡتُمۡ مَّا يَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ (النور۔17)

’’جب تم نے یہ قصہ سنا تو تم نے یوں کیوں نہ کہہ دیا ہمیں مناسب نہیں کہ ہم ایسی بات کریں۔سبحانک یہ تو بہتانِ عظیم ہے۔‘‘

غور فرمائیے الفاظ بھی وہی دہرائے گئے جو حضرت عمرؓ کے تھے۔

۸۔حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ازواجِ مطہرات مل کر آپ ؐ سے جھگڑا کرنے لگیں تو میں نے انہیں کہا کہ کچھ بعید نہیں کہ پیغمبر تم سب کو طلاق دے دیں۔اور آپ ؐ کا رب آپ ؐ کو بہترین بیویاں عطا کر دے۔

عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنۡ طَلَّقَكُنَّ اَنۡ يُّبۡدِلَهٗۤ اَزۡوَاجًا خَيۡرًا مِّنۡكُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبۡكَارًا (التحریم5)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ کم ہی ایسا ہوا کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور اللہ سے یہ امید نہ رکھی ہو کہ وہ میرے قول کی تصدیق فرما دیگا جب یہ سورۃ تحریم کی آیات نازل ہوئیں میں نے حضورؐ سے پوچھا کہ کیا آپؐ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ فرمایا نہیں! اس پر میں نے مسجد نبوی کے دروازے پر ہو کر کہا کہ حضورؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی، جبکہ لوگ متفکر بیٹھے تھے۔(تفہیم القرآن، مولانا مودودی)

۹۔سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں جب عبداللہ بن ابی مر گیا تو اس کے بیٹے نے حضورؐ کو اپنا کرتہ عنایت کرنے کی استدعا کی تاکہ ’’اسے کفن دے‘‘ آپؐ نے عنایت فرما دیا، پھر اس نے درخواست کی کہ اس پر جنازہ پڑھائیے۔آپؐ اس مقصد کے لئے کھڑے ہوئے تو حضرت عمرؓ نے آپؐ کا دامن تھام لیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے لوگوں کا جنازہ پڑھنے سے روکا ہے۔آپؐ نے جواب دیا کہ مجھے روکا نہیں بلکہ اختیار دیا ہے کہ آپؐ ان کے لئے دعا کریں یا نہ کریں، خواہ ستر بار استغفار کریں میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔حضرت عمرؓ نے اس منافق کی کرتوتیں یاد دلائیں۔اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ

جبکہ آپؐ نمازِ جنازہ پڑھ چکے تھے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ حکم نازل ہوا نہ ہی ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں کبھی بھی۔ (التوبہ 84)

۱۰۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباس فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر کے بعد جب کفار قید کر لیے گئے تو آپؐ نے ابوبکرؓ و عمرؓ سے قیدیوں کے بارے میں رائے لی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اے نبیؐ یہ چچا کے بیٹے خاندان کے لوگ ہیں ان سے فدیہ لیا جائے تاکہ ہم ان کے مقابلے میں قوت والے ہوں اور شاید اللہ تعالیٰ انہیں اسلام کی ہدایت عطا فرمادیں۔ پھر آپؐ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا انہوں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ میری رائے ابوبکرؓ کی رائے سے مختلف ہے۔ آپؐ انہیں ہمارے حوالے کیجیے تاکہ ہم خود انکی گردنیں اڑا دیں۔ عقیل (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کو علیؓ کے سپرد کیجیے اور میرے حوالے فلاں کو کریں ہم ان کو قتل کریں گے کہ یہ کفر کے سرغنے اور ستون ہیں۔ حضورؐ ابوبکرؓ کی رائے سے متفق ہوئے۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ بیٹھے رو رہے ہیں میں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ مجھے بتائیے آپ کیوں رو رہے ہیں کہ میں بھی روؤں یا کم از کم رونی صورت ہی بنالوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے ساتھیوں نے جو قیدیوں کا فدیہ لے کر چھوڑنے کا مجھے مشورہ دیا تھا میرے سامنے ان کا عذاب پیش کیا گیا جو اس درخت سے بھی زیادہ قریب تھا اور پھر یہ آیات نازل ہوئیں "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (سورۃ انفال)۔

نبیؐ کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ اس کے پاس جنگی قیدی آتے تاآنکہ میدانِ جنگ میں انہیں (کافروں) کو اچھی طرح قتل نہ کر دیا جاتا۔ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اللہ تمہارے لیے آخرت چاہتا ہے۔ اللہ ہی غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر ایسا ہونا پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ آپؐ نے (فدیہ) لیا ہے اس کی پاداش میں آپؐ کو بڑی سزا دی جاتی (سورۃ انفال 67۔ تیسیر القرآن جلد دوم)

۱۱۔ سیدنا عمر دوپہر کے وقت اپنے گھر میں آرام فرما رہے تھے۔ ایک بچہ بھاگا ہوا آیا اور آپؓ کو ا

ٹھانے لگا کہ حضورؐ آپ کو بلا رہے ہیں۔ جبکہ آپؓ کے جسم پر کچھ کپڑا بھی اترا ہوا تھا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کو خیال آیا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ کچھ اوقات میں کمروں میں داخلہ بند ہو جائے اور پابندی لگا دی جائے۔ اس کے بعد ان آیات کا نزول ہوا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النور 85)

ترجمہ: اے ایمان والو تمہارے غلاموں اور حدِ بلوغ تک نہ پہنچے ہوئے لڑکوں پر لازم ہے کہ وہ گھروں میں دن میں تین بار اجازت سے داخل ہوں۔ نماز فجر سے پہلے، ظہر کے وقت جب تم کپڑے اتارے ہوئے ہوتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد یہ تین اوقات پردے کے ہیں اس کے علاوہ ان کے بلا اجازت آنے جانے سے نہ ان پر کچھ گناہ ہے نہ تم پر۔

۱۲۔ سیدنا عمرؓ کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون 12تا14)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے یعنی غذا سے بنایا۔ پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ ایک مدت تک ایک محفوظ جگہ (رحم) میں رہا۔ پھر ہم نے اس نطفے کو خون کا لوتھڑا بنایا۔ پھر خون کے لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنایا۔ پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا۔ تو میں نے بے ساختہ تبارک اللہ واحسن الخالقین کہا۔ قدرت الٰہی کی سیدنا عمرؓ کے ساتھ موافقت دیکھئے کہ اس آیت کے آخری الفاظ بھی یہی وارد ہوئے۔ سبحان اللہ!

۱۳۔ جب مسلمان کسی سریہ سے لوٹتے تو منافق وکافر کچھ میل پہلے ہی انہیں جا ملتے، تمام معلومات حاصل کر لیتے اور پھر زور و شور سے بیان کرتے۔ سیدنا عمرؓ نے حضورؐ کو مشورہ دیا کہ مہمات سے واپس آنے

والوں سے کہیں کہ وہ لوگ انہیں نہ بتایا کریں۔تمام معلومات سے سب سے پہلے حضورؐ کو آگاہ کیا کریں۔ تو درج ذیل آیات نازل ہوئیں۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (النساء83)

’’اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اسے مشہور کر دیتے ہیں۔اگر اس بات کو اپنے معاملات کے نگران لوگوں کے پاس لاتے، تو ان میں سے ایسے لوگ اس بات کو جانتے جو صحیح نتیجہ نکالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔‘‘

یہ میری کم مائیگی یا کم علمی ہے کہ 16 واقعات تک نہیں پہنچ پائی۔ورنہ حضرت عمرؓ کی شخصیت تو ایسی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا عمرؓ اہلِ جنت کے چراغ ہیں (ابونعیم) یہ حدیث پاک حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ابنِ عساکر نے صعب بن جثامہؓ سے روایت کی ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے عمرؓ کے دل وزبان پر حق جاری کر دیا ہے (ابوداؤد۔حاکم) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: میں جن وانس کے شیطانوں کو عمرؓ سے بھاگتے ہوئے دیکھ رہا ہوں (ترمذی)

ابی بن کعبؓ روایت کرتے ہیں۔آپؐ نے فرمایا: عمرؓ پہلے شخص ہیں جن سے حق تعالیٰ قیامت کے مصافحہ کریگا، سلام ارشاد فرمائے گا اور انہیں ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کرے گا (ابن ماجہ، حاکم)

قدامہ بن مطعونؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: یہ (حضرت عمرؓ) فتنے کو بند کر دینے والا ہے، اور دستِ مبارک سے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جب تک یہ تم لوگوں کے درمیان زندہ ہے تمہارے اور فتنوں کے درمیان مضبوطی سے بند بندھا رہے گا۔

(حوالہ کتب: تفہیم القرآن، تیسیر القرآن (عبدالرحمٰن کیلانی) سیدنا عمرؓ فاروق کی زندگی کے سنہرے واقعات از عبدالمالک مجاہد)

☆☆☆

# حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب

بقیع کے خاموش عربی قبرستان میں آج بھی وہ ''عظیم عورت'' موت کی میٹھی نیند سو رہی ہے جس نے معرکۂ احد کی نازک گھاٹی میں ''مرد'' کو ایمان پر جینا اور مرنا سکھایا! جس کے مقدس قدم ایک فولادی چٹان بن کر اسی گھمسان رن کے سینے میں اتر گئے، جس کی لہو میں نہائی ہوئی زمین مجاہد سورماؤں کے پاؤں تلے کھسک رہی تھی۔ خوف اور مایوسی کے روح فرسا بوجھ سے جب سینکڑوں نوآموز مومنوں کے دل سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہے تھے تو اس کی زبان پر ایمان کی رجز یہ للکار بلند ہو رہی تھی۔ جن حادثوں کی زد میں ''مردانگی'' کی فوجوں کا ایک حصہ پیٹھ دکھا چکا تھا وہاں سرفروشانہ جذبات کی شدتوں میں ایک عورت نے سیکڑوں نیزوں ...... بھالوں اور تیروں کی باڑھ پر اپنا سینہ کھول دیا تھا!

یہ تھیں صفیہؓ!

قریش کے بوڑھے ہیرو عبدالمطلب کی بیٹی!

سیدالشہداء حضرت امیر حمزہ کی جری بہن!!

اور...... محمدؐ عربی کی وہ انتہائی خوش نصیب پھوپھی جن کی تقدیر میں آخرت کا سکون جاوداں اور ایمان کی وہ لازوال دولت تھی جس کے سامنے قیصر و کسریٰ کے فلک بوس محلوں کا غرور زمیں بوس ہوا چاہتا تھا۔ یہ صفیہؓ تھیں جنھوں نے خدا کا انکار کرنے والوں کی خوں ریز تلواروں کی چھاؤں میں خدائے ذوالجلال کی ہستی اور محمدؐ کی رسالت پر بے پناہ گواہی دینے کے لیے والہانہ عقیدت کے بیتاب ہاتھوں سے خود اپنا دل چیر کر رکھ دیا تھا! ...... یہ صفیہؓ تھیں ...... زبیر بن عوام کی ماں جن کو ہجرت کی زہرہ گداز گھاٹی میں کبھی بھرے وطن کی دلفریب رعنائیوں سے کٹ کر خدائے واحد کی پکار پر خانہ ویرانیوں کی طرف کشاں کشاں بڑھتے ہوئے دیکھا گیا تھا ...... جب موت کے اس پار ...... ایک نامعلوم، آخری ''مستقبل'' کے تصور میں گم ہو کر وہ اپنے زندہ حال و ماضی کو اپنے ہاتھوں سے بخوشی دفنا رہی تھیں!

جنھوں نے حقیقت کا عظیم عرفان حاصل کرنے

کے بعد کفر و شرک کے لمبے چوڑے وطن کے مقابلے میں قبر کا وہ تنگ کونہ پسند کیا تھا جس کی گہرائیوں میں اتر کر وہ اپنے خدا سے ملاقات کر سکیں۔

یہ تھیں وہ انسانی روحیں جو خوب سمجھ گئیں تھیں کہ آدمی کا حقیقی وطن یہ ''زمین'' نہیں، اس کے ''خدا کا گھر'' ہے۔ جہاں پلٹ جانے کے لیے انسانی نسل آب و گل کی بھول بھلیوں میں نہ جانے کب سے دور افتادہ پردیس کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔

احد میں اسلام کی ''ہزیمت'' کی ہوشربا خبر یاس و حرمان اور درد و الم لیے ہوئے مدینے میں پہنچی تھی مگر وہ پلٹی تو اس کے ساتھ نئی زندگی اور تازہ دم حوصلوں کا طوفانی ریلا تھا۔

خود اپنی پناہ گاہوں کو توڑتا پھوڑتا ہوا خطرات کی طرف بے تابانہ بڑھتا ہوا انسانی سمندر۔

تھکے ہارے مجاہدوں اور دل شکستہ بہادروں کو غیرت دلانے کے لیے اور غنیم کی ظالمانہ قوت سے ٹکرا جانے کے لیے وہ کمزور و ناتواں طبقہ گھروں کی چار دیواری کو پھاند کر میدانِ کارزار میں کود پڑا تھا جن کے شانوں پر جہاد نے ہتھیاروں کا بوجھ لادنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ مگر جو اسلام کے لیے اپنے کاندھوں پر اپنی لاش اٹھانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

عورتوں......

بوڑھوں......

بیماروں......

اور بچوں کا کمزور و ناتواں طبقہ!!

مگر نہیں!!

وہ کمزور نہ تھے! ان کا ایمان ''خدا'' پر تھا۔

خدا...... اس زمین و آسمان کی عظیم ترین طاقت ان کی پشت پناہ تھی۔ وہی طاقت جس کے اشارے پر سنگین پہاڑ اپنا دل شق کر لیتے ہیں۔ اور طوفانی سمندروں کا جلال ایک تہ نشین سجدے میں گم ہو جاتا ہے...... سیاہ گھٹاؤں میں بل کھاتی ہوئی بجلی جس کی یاد میں تڑپتی ہے اور گرجتے کڑکتے بادلوں کے ہونٹوں پر جس کی عظمت بیکراں کا سرمدی راگ گونجتا ہے۔

بھوک ...... افلاس اور فاقوں کی مار جانوروں کو ادھ مرا کر سکتی ہے۔ مگر اس انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جس کے دل میں اس کا خدا سما گیا ہو!...... نہیں!...... وہ کمزور ناتواں نہ تھے! ایمان اور بزدلی دو ایسے مشرق و مغرب ہیں جو ہمیشہ جدا رہتے ہیں اور کبھی نہیں مل سکتے۔

اللہ اکبر!

کیسا عجیب تھا وہ منظر......

جب ریگستان کے تپے ہوئے شعلوں......

تلواروں کی خونین چھاؤں میں......

دلوں میں چھپا ہوا ''ایمان'' آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا!

قبروں میں پاؤں لٹکائے ہوئے بوڑھے ذوقِ شہادت میں سر کے بل چل دیے تھے۔ سسکتے ہوئے بیماروں نے زندگی کی ساری سکت مجتمع کر کے اپنی موت پر دھاوا بول دیا تھا!...... گھروں کی دیواروں میں بند عورتوں نے جنگ کے ان وسیع میدانوں میں قدم رکھ دیا تھا جہاں زندگی اور موت کی سرحدیں مل جاتی ہیں ...... وہی عورتیں جن کو خدا کے رسولؐ نے ''آبگینہ'' کہا تھا...... آج وہی نازک آبگینہ آہن وفولاد میں ڈوبی ہوئی فوجوں کو للکار رہا تھا! خدا کی زمین کو فتنہ وفساد کی غلاظتوں سے لتھیڑنے والے پاپیوں کے خلاف معصوم بچوں میں چھپے ہوئے انسانی فرشتے اینٹ پتھر اور آگ، خون کی دنیا میں صف آراء ہو گئے تھے!

یہ وہ سادہ دل روحیں تھیں جن کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ جب ''اسلام'' خطرے میں ہو تو مسلمان کسی پناہ گاہ میں چھپ کر جینے کی ذلیل کوشش کو ادا کر سکتا ہے! وہ نہ سمجھ پاتی تھیں کہ جب تک ایک آخری مسلمان کے جسم میں آخری قطرۂ خون موجود ہو نوائے حق بلند کرنے والے حلق کس طرح خشک ہو سکتے ہیں؟

رسولؐ خدا کی شہادت کی جھوٹی خبر پر ہمت ہارنے والے کچھ نو آموز مجاہد جب جہاد کے میدان سے بھاگ رہے تھے تو ان کی پشت پر ایک للکار بلند ہوئی!

''کہاں جا رہے ہو؟ ...... جہاد سے پیٹھ پھیر کر! ...... اسلام کا سفینہ غرق ہوتا ہوا دیکھ کر!!...... اور محمدؐ کو دشمنوں کے حوالے کر کے؟...... آخر کہاں بھاگے جا رہے ہو تم لوگ؟...... ہیہات! ہیہات!! ......نہیں! ......نہیں!!......تم نہیں جا سکتے! ...... پلٹو!! تمھیں پلٹنا ہی پڑے گا! ...... یہ جانیں جیتے جی یوں میدان جہاد سے باہر نہیں جا سکتیں جن کو پہلے ہی جنت کے عوض کسی اور نہیں خدائے کائنات کے ہاتھوں بیچا جا چکا ہے!''

یہ انسانی آواز تھی کہ صورِ اسرافیل؟

سوزِ یقین سے دہکتی ہوئی!

درد ہی درد میں ڈوبی ہوئی خوں چکاں پکار!

غیرتِ ایمانی کی گھائل چیخ!

فرض کی بیتابانہ ہوک!!

احد کے پہاڑوں تک کا دل ہلا دینے، پگھلا دینے والی فریاد!!

پسپا ہونے والے مجاہدوں نے جیسے اچانک کسی خواب پریشاں سے چونک کرآنکھیں کھول دیں!......

ڈوبتے ہوئے دل تڑپ کر آنکھوں میں آ گئے! ......روح ایک اضطراب بنی اور جسم کی ہر بُن مو سے ابل پڑی۔ اعصاب میں خون کی گردش سنسنا گئی اور غیرت ایمانی کی بھرپور چوٹ سے چہرے تمتما گئے۔

ضمیر کی ایک دلدوز چیخ اور ایمان و یقین کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ وہ سب سچ مچ پلٹ پڑے تو دیکھا کہ یہ......ایک عورت کی آواز تھی!

تلواروں کی تیز دھار پر کھڑی ہوئی نہتی کمزور عورت ہمت ہارنے والے مرد کو للکار رہی تھی......

نہیں!......وہ ایک ''عورت'' نہ تھی!

وہ غیرتِ ایمانی کا ازلی شعلہ تھا!

وہ خدا کی مشیت کا جلال تھا!

وہ جبریلؑ کی آواز تھی!

وہ محمدؐ کا یقین تھا!!

ہاں......وہ صفیہؓ تھی!

عظیم صفیہؓ!...... بے جگر مجاہدہ!......خدا کی دیوانی پجارن!...... رسولؐ کی وفا کیش صحابیہؓ!......دنیا کی دھوپ چھاؤں سے بلند و بے نیاز ......آخرت کے تصور پر وجد کرتی ہوئی پاک وصاف روح!!

اور...... یہ سب کچھ کسی یک لمحی جوش کا کرشمہ نہ تھا۔ ایمان روح میں اتر جاتا ہے تو جوش و ہوش کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ دل و دماغ جذبات اور افکار ایک دوسرے میں جذب ہو کر اس لرزہ خیز آواز میں ڈھل جاتے ہیں جو جان کنی کے زرد ہونٹوں پر پوری قوت سے جھوٹے خداؤں کو للکارتی اور خدائے واحد کو پکارتی ہے تو وجود کا سارا مادی طلسم پاش پاش ہو کر خاک میں بکھر جاتا ہے اور روح ایک جست میں کائنات کا فاصلہ طے کر کے اپنے خدا سے جا ملتی ہے......

یہی وہ جوش اور ہوش کی ایمانی طاقت تھی جو صفیہؓ کو ان بلندیوں تک لے اڑی جس کی توقع ایک عورت سے ایک رسول کو بھی نہ تھی!

''اے زبیرؓ!...... آنحضرتؐ نے مضطرب ہو کر صفیہؓ کے لخت جگر کو پکارا جو صفیہؓ جنگ احد کے خاتمے کے بعد ...... جوش نہیں ٹھنڈے ہوش کی حالت میں اپنے بھائی امیر حمزہؓ کی لاش دیکھنے جا رہی تھیں۔

''اے زبیرؓ!......روکو!......اپنی والدہ کو روکو!...... بھائی کی لاش اس قابل نہیں کہ ایک بہن کا کمزور دل اس کو دیکھنے کی تاب لا سکے۔ایک زبردست شہید کی مثلہ شدہ لاش جس کا کلیجہ نکالا اور چبالیا گیا!''

لیکن زبیرؓ بن عوام نے اپنی جلیل القدر ماں کو رسولؐ خدا کا یہ درد و شفقت بھرا حکم سنایا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آئے نہ دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہوئی! اپنے بھائی کے اس دردناک حادثے پر انھوں نے اس کے سوا کچھ بھی نہ سوچا کہ یہ المناک صورت حال کہانی کا انجام نہیں ...... ایک عظیم الشان انجام کا قابل صد رشک آغاز ہے!......خدا کی راہ میں مومن یا مومنہ کے جسم میں ایک ہلکی سی پھانس چبھتی ہے تو رحمت باری جوش میں آکر دوزخ کا ایک مہیب شعلہ اس کے لیے بجھا دیتی ہے ...... پھر یہاں تو ایک پھانس نہیں ! ...... آبدار خنجر بھونک دیے گئے۔ پھر اس لاش پر مشق ستم کی انتہا کی گئی......کون جانے کہ بندے کی ایسی خوں چکاں لاش کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے خدا کی رحمت کس شان سے آگے بڑھی ہوگی؟''

''بیٹا!'' حضرت صفیہؓ نے کمال متانت اور انتہائے سکون کی آواز میں کہا۔''رسولؐ خدا سے عرض کرنا کہ کیا صفیہؓ آپ کی کنیز نہیں؟......وہ جانتی ہے کہ خدا کی راہ میں میرے بھیا نے ایک بہت بڑی قربانی پیش کی ہے۔لیکن خدا کے بے شمار احسانات کو دیکھا جائے تو کوئی قربانی بھی بہت بڑی قربانی کہلائے جانے کی مستحق نہیں۔ پھر میں اس شہادت پر کس طرح ماتم کر سکتی ہوں جس پر خدا ...... میرا خدا خوش ہو رہا ہے؟''

اور...... جب ان کو دربار رسالت سے یہ اذن مل گیا تو سچ مچ غیر معمولی ایمان نے معمولی اور فطری جذبات کو کچل کر رکھ دیا......صفیہؓ اپنے سینے میں درد و کرب کا طوفان روکے ہوئے تھیں۔ جس کو اندر ہی اندر روکنے کی کوشش میں سنگلاخ چٹانیں شق ہو جائیں۔اور پہاڑ سینہ چاک ہو جائیں۔فطری جذبات کے کرب میں ان کا دل بھر بھر کر آنا چاہتا تھا مگر آخرت کی یقینی کامیابی کا جگمگاتا تصور اس سے پہلے روح کی خوبصورت مسکراہٹ بکھیر جاتا تھا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

یہ تھے وہ الفاظ جو ان کی زبان سے نکلے۔ یہ اس لافانی حقیقت کا اعلان تھا کہ زندگی کا خاتمہ تو اس دنیا کا کوئی انوکھا حادثہ نہیں......زندگی کی موت تو خود زندگی

سے کہیں زیادہ ٹھوس اور یقینی شے ہے! لیکن کیسا اچھوتا اور کتنا غیر معمولی تھا یہ عظیم واقعہ کہ ایک زندگی خالق زندگی کے کام آئی! ایک فانی انسان نے اس طرح جان دی کہ زندۂ جاوید خدا پکار اٹھا:

''نہیں! ...... یہ موت نہیں ...... زندگی ہے جس کے لیے آسمانوں کا رزق تیار کیا گیا ہے۔

☆......☆......☆

وہ بھی کتنا حیرت ناک منظر ہوگا!

جب کمزور عورت کی پناہ گاہ پر......قلعۂ اطم پر جو بہادر ہستی پہرہ دے رہی تھی وہ خود بھی مرد نہیں ایک ''عورت'' ہی تھی! یہ وہی صفیہ تھیں!

جنگ احد میں جس مجاہدہ کے جوش ایمانی نے ہمت ہاری ہوئی فوجوں میں جذب وجنون کی آگ بھر دی تھی آج اس کے ایمان ویقین کو تن تنہا فوجوں کا فرض عظیم ادا کرنا تھا۔

کیسی ہولناک تھی یہ فرض کی گھاٹی!

مدینے کی ساری تیغ آزما مسلم آبادی غزوۂ خندق کے محاذ پر سمٹ گئی تھی...... جب یہودیوں اور مشرکوں کی متحدہ افواج کو اپنی ایمانی طاقت کا یقین دلانے کے لیے شوہروں نے اپنی بیویوں کو مدینے میں خدا کے حوالے کیا اور باپ اپنے شیر خوار بچوں کو کمزور ماؤں کے سینے سے چمٹا ہوا دیکھ کر شہادت کو سینے سے لگانے چل دیے تھے۔

اسی وقت مدینے میں یہودی یہ خوفناک سازش کر رہے تھے کہ مجاہدوں کے خانوادوں کو ان کی عدم موجودگی میں برباد کر دیا جائے!

آج صفیہ کو یہ حقیقت ثابت کرنی تھی کہ جن عورتوں کی ''کمزوری'' پر وہ لوگ للچائی ہوئی نظریں ڈال رہے ہیں ان کے سینوں میں بھی توحید کی وہی آتش سوزاں ہے جو خدا ناشناس انسانی درندوں کو خوف و دہشت سے شل کر ڈالتی ہے۔ آج صفیہ کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں صرف خطرے اور دشمن دکھائی دیتے تھے تو کیا؟ آج اس کی درد بھری پکار کا مخاطب احد کا انسانی لشکر نہیں......اس کا اکیلا، توانا خدا تھا!

قلعہ اطم کی فصیل پر سیاہ فام خطرات میں چمکنے والی دو نسوانی آنکھیں آج مردوں کی پشت پناہی اور دنیا کے سہاروں کو جتنا دور...... بہت دور دیکھ رہی تھیں ان کو اتنا ہی خدا نزدیک تر آتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہر لمحہ اپنی کائنات کے ذرے ذرے پر نظر جمائے رکھنے والا خدا جس کی آنکھ کو نہ اونگھ بند کر سکتی ہے اور نہ موت!

کیسا امر سہارا!

کتنا اٹل!......کتنا محکم اور یقینی!!

''اے حسانؓ!''صفیہ نے ایک ایسی آواز میں کہا جس میں ہوش اور جوش کے دو اتھاہ سمندر مل گئے تھے۔

''دیکھ رہے ہو!......وہ قلعہ کے دروازے سے لگا ہوا سپاہی!! ...... یقیناً یہ یہودیوں کا بزدل جاسوس ہے جو کھل کر ہماری طاقت کو آزمانے کے بجائے چھپ کر ہماری کمزوریوں کا سراغ لگانے آیا ہے...... (یکا یک جوش کے امنڈتے ہوئے توازن کے ساتھ......تو پھر جاؤ اے حسان! ...... جاؤ! اور اس کا سرتن سے جدا کر کے اس کو شجاعت اور بزدلی کا فرق سمجھا دو! ...... جاؤ!!''

صفیہ کی آواز میں ایمان کی دھمک کے ساتھ ساتھ اس ٹھوس حقیقت کا فطری احساس تھا کہ وہ خود ایک ''عورت'' ہی ہیں ......اور حسان ایک مرد! ...... ایک ''مرد'' کے مقابلے میں ایک مرد کا انتخاب زیادہ قرین مصلحت ہے۔

حضرت حسانؓ ابن ثابت کے لبوں سے ایک درد بھری، دلخراش کراہ نکلی ''آہ اے صفیہ! اگر طبعی ضعفِ قلب کے عارضے نے حسان کو اس عظیم سعادت کے قابل چھوڑا ہوتا تو......کیا وہ آج عورتوں کے درمیان پڑا نظر آتا......؟''

مرد کی معذور سسکی سنتے ہی ''عورت'' نے محسوس کیا کہ اب فرض کا بارِ گراں اس کے شانوں پر آنا ہی چاہیے! فرض! ...... کمزوری میں طاقت کے خزانے الٹ دینے والا فرض!......عورت کے سست روٹھنڈے خون میں غیرت ایمانی اور فرض کی چنگاریوں نے گرم گرم سیسہ پگھلا دیا۔اور صفیہؓ حسانؓ کا درد بھرا حقیقی عذر سنتے ہی ان کا جملہ پورا ہونے کا انتظار کیے بغیر آخری فیصلہ پر جست کر چکی تھیں۔یہ ''فیصلہ'' اُن کو شعلۂ جوالہ بنائے ہوئے بجلی کی طرح حرکت میں لایا اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ قلعہ سے نیچے اتر کر تڑپ کر پھاٹک کے پاس جا پہنچیں۔

اور ...... باہر کھڑے ہوئے یہودی پر وہ حقیقت ایک زبردست دھماکے کے ساتھ واقع ہوئی جس کا تصور اس کو شاید اپنے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔قلعہ کا دروازہ تیزی سے چوپٹ کھلا اور ''عورت'' نمودار ہوئی! ......عورت! جس کی کمزوری کی گھات اس کو یہاں تک لائی تھی۔ایک بے پناہ طاقت کی شکل میں اس کے سر پر ٹوٹ پڑی تھی! جس کے پاس نہ کوئی تلوار

تھی نہ کمان!...... بلکہ محض خیمہ کی ایک کمزور سی لکڑی جو غیرت ایمانی سے ایک کوہ افگن ضرب بن کر چشم زدن میں ایک ناپاک انسانی کھوپڑی کو پاش پاش کرگئی۔

یہودی مرد ایک بزدل لاش کی طرح ایک مومنہ کے قدموں میں بے سدھ پڑا کا پڑا رہ گیا! ایک بہت بلند حقیقت کی تاب نہ لا کر جیسے اس کے ہوش وحواس کی آنکھیں پتھرا گئیں تھیں اور عقل کو چکر آ گیا تھا لیکن کیسی عجیب تھی وہ عورت جو ایک دشمن مرد کو قدموں میں بیہوش پڑا ہوا دیکھ کر فخر وغرور سے سینہ پھلانے اور سر اٹھانے کے بجائے بار احسان اور جذبۂ شکر سے ایک ان دیکھی ذات کے آگے کچھ اور جھک گئی تھی! جس خدا کے بھروسے پر وہ قلعہ سے باہر موت کے منہ میں کود پڑی تھی اس موت کو شکست فاش دینے کے بعد اسی خدا کا شکر ادا کرنا ضروری تھا۔

شکر کے جذبات سے یہ سرشار عورت پھر ایک بار قلعہ میں داخل ہوئی۔ انھوں نے سوچا کہ حسانؓ بے چارے ضعفِ قلب کے دیرینہ مریض...... حسان کا مشکل کام صحتمند صفیہ نے آسان کر دیا ہے اور اب یہ کچھ دشوار نہیں کہ وہ بیہوش دشمن کا سر اتار کر قلعہ کے سامنے ڈال دیں تا کہ سازشی گروہ یہاں تک آنے کی جرات کرے تو یہ لاش ان کے آگے بڑھنے کے سارے حوصلے ملیامیٹ کر دے۔

''جلدی کرو حسانؓ! ...... دشمن وہ پڑا ہے! ...... جاؤ اس کا سر کاٹ کر ڈال دو اور حملہ آوروں کے چھکے چھڑا دو...... ہاں وہ سمجھ لیں گے کہ قلعہ میں ہماری نہیں خود ان کی موت چھپی ہوئی ہے!''

لیکن اس بار پھر حضرت حسان کے کملائے ہوئے غمناک چہرے پر ایک غیر معمولی بیچارگی، بے بسی ظاہر ہوئی۔

یہ خاموش جواب تھا کہ ''کاش تم مجھ سے پوچھنے سے پہلے سمجھ جاتیں کہ ضعف قلب سے گھائل دل کے لیے ایک مسلح دشمن اور ایک خاک پر اوندھے منہ پڑے ہوئے سپاہی کا سر کاٹ ڈالنا برابر ہے۔

پھر حضرت صفیہ اٹھیں...... انھیں آج مردانگی کے نقطۂ عروج تک چڑھ جانا تھا۔

مرد کی حقیقی معذوری نے عورت کی پرجوش طاقت میں ایک نیا سیماب بھر دیا۔ وہ تڑپتی ہوئی بجلی ایک بار پھر لہرائی اور باہر پڑے ہوئے دشمن پر ٹوٹ کر گری! فرض کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا گیا۔

قلعۂ اطم کو لوٹنے کے لیے جب یہودی جتھہ

شبخون مارنے آیا تو سر بریدہ لاش کو دیکھ کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔

ان کو یقین ہو گیا کہ قلعہ میں عورتیں ہی نہیں جانباز مرد بھی ہیں۔ وہی ''مرد'' جن کی شجاعت میں انسان نہیں خدا کی طاقت دکھائی دیتی تھی۔ بڑے بڑے سورماؤں کے چھکے چھڑانے والی طاقت!

لیکن......

وہ پھر بھول رہے تھے کہ ایمان کے دائرے میں مرد اور عورت دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا!...... دونوں ایک ہی خدائے توانا کے لیے جیتے اور مرتے ہیں اور دونوں کے ساتھ ایک ہی خدائے بزرگ و برتر کے غیبی لشکر امداد کے لیے زمین پر اتر آتے ہیں۔

☆☆☆

## غزل

لہو کے اشک بہائیں تو روشنی ہو گی
جگر کا خون جلائیں تو زندگی ہوگی

بہار تازہ کے آنے میں دیر ہی کیا ہے؟
کھلیں گے پھول جو ہر سو تو تازگی ہوگی

انوکھی شان ، یہ سج دھج یہ جگنوؤں کی برات
ذرا سی دیر میں دور اس سے تیرگی ہوگی

لہو سے سینچ کے رکھنا سدا انہیں روشن
''یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی''

دکھائی دیتا ہے مشرق سے اک نیا سورج
فلک پہ ابھرے گا جس دم تو روشنی ہوگی

سمٹ رہے ہیں اندھیرے سیاہ راتوں کے
سؔحر کے آنے کی ہر سو صدا سنی ہوگی

(شاہدہ سحر)

## مجھے ارزاں نہیں جانو!

(عالمی یوم خواتین کے موقع پر)

مرے خالق نے میری صنف کو
نازک بنایا ہے
میری ہستی کو اس نے
باعث رحمت بنایا ہے
مجھے توقیر بخشی ہے
خلوص و مہر کا اس نے مجھے
پیکر بنایا ہے
مجھے ایثار کا خوگر بنایا ہے
مجھے انسانیت کا اہم تر
کردار بخشا ہے
مجھے فہم و بصیرت
علم اور ادراک بخشا ہے
مرے ہاتھوں میں اس نے
تربیت کی باگ رکھی ہے
مجھے حسنِ عمل حسنِ سلیقہ
اس نے بخشا ہے
مری نسوانیت کو
اس نے اک تعظیم بخشی ہے
مجھے چادر سے ڈھانپا ہے
مجھے پامال ہونے سے بچایا ہے!
وراثت میں میرا حصہ مقرر ہے
میری رائے مقدم ہے
عبادت میں مجھے مردوں سے کم
اجرت نہیں ملتی
(میری خدمت نہ کی جائے تو
جنت بھی نہیں ملتی!)
مرے یہ ہاتھ ہی
گھر کے در و دیوار کو جنت بناتے ہیں
مرے دم سے یہاں
امن و سکوں آباد رہتا ہے
(پسِ فتح و ظفر بھی تو
مرا ہی ہاتھ ہوتا ہے!)
نہ میں پاؤں کی جوتی ہوں
نہ باندی ہوں
مجھے ارزاں نہیں سمجھو
نہ بے مایہ مجھے جانو
مرے منصب سے مجھ کو
تم اگر معزول کر دو گے
مرے حق سے مجھے محروم رکھو گے
مجھے پاؤں کی جوتی
خادمہ، لونڈی ہی سمجھو گے
تو پھر
گھر میں سکوں
اور گھر سے باہر امن و خوشحالی کو
تم تا عمر ترسو گے!!

(شمیم فاطمہ)

# پاک نگر کے پیارے لوگو!

پاک نگر کے پیارے لوگو! دل کا نگر اجلانا سیکھو
سوچ بھی اجلی کام بھی اجلے نفس کو بھی نکھرانا سیکھو
اُلفت ، شفقت ، خدمت ، چاہت اپنا شعار بنانا سیکھو
پاک نگر کے پیارے لوگو!

حرص و ہوس خناس ہیں من کے اپنا آپ بچانا سیکھو
بغض و عناد ہیں روگ دلوں کے ان سے جان چھڑانا سیکھو
فرقہ پرستی دین کا فتنہ حکمت سے سمجھانا سیکھو
پاک نگر کے پیارے لوگو!

دہشت گردی ایک معّمہ یہ گتھی سلجھانا سیکھو
عزم و یقیں کے ذوق سے اپنی دنیا نئی بسانا سیکھو
شوقِ شہادت عام کرو اندر کی تڑپ اپنانا سیکھو
پاک نگر کے پیارے لوگو!

دینِ مبین کا پرچم لے کر اونچی کمند لگانا سیکھو
یک جہتی میں امن واماں ہے اینٹ سے اینٹ ملانا سیکھو
قریہ قریہ نگری نگری پیار کے دیپ جلانا سیکھو
پاک نگر کے پیارے لوگو!

پاک وطن ہے تحفہِ یزداں جنت اسے بنانا سیکھو
نصف صدی کا قرض ہے ہم پر اب تو اسے چکانا سیکھو
گلشنؔ کا پیغام یہی ہے اپنا عہد نبھانا سیکھو
پاک نگر کے پیارے لوگو!

(ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا)

# مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

میرے گھر کے صدر دروازے میں نصب شدہ تالا اچانک میری غلامی سے آزاد ہو کر من مانی کرنے پر اتر آیا تھا۔ بار بار چابی گھمانے کے باوجود کھل کر نہ دیتا۔ میں نے تالا کھولنے کیلئے کئی جتن کر ڈالے۔ کبھی الٹی چابی گھمائی تو کبھی سیدھی کبھی سختی کے ساتھ تو کبھی نرمی سے۔ کبھی ملتجیانہ انداز اپنایا تو کبھی فدویانہ، کبھی مشفقانہ تو کبھی بہیمانہ لیکن نتیجہ ایک ہی رہا یعنی زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ چنانچہ میں نے بشیر میاں کو فون کر کے بلایا۔

بشیر میاں دبلے پتلے دھان پان سے معمر آدمی ہیں۔ انہیں اپنے کام میں مہارت حاصل ہے۔ جب بلاؤ آ جاتے ہیں۔ وہ اہل زبان ہیں اس لئے گفتگو کے دوران ان کی زبان جھول نہیں کھاتی۔ ان کی بات چیت یکساں تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ ہر قسم کے عام موضوعات پر وہ روانی کے ساتھ بلاتکان بولتے ہیں۔ دورانِ گفتگو وہ مخاطب کے چہرے کے تاثرات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں تاکہ وہ خود اپنی آواز کے صوتی تاثرات کے آثار کو دیکھ کر متاثر نہ ہو جائیں اور یوں سلسلۂ کلام ٹوٹنے کی نوبت نہ آ جائے۔ وہ موقع بے موقع نصیحت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور پند و نصائح کے دورانیے کو اپنے زورِ خطابت اور شوقِ خطابت سے اس قدر طویل کر دیتے ہیں کہ مخاطب جائے وقوع سے فرار ہونے میں عافیت سمجھتا ہے لیکن چونکہ قابلِ اعتماد آدمی ہیں اور گھر کے سامان کی مرمت کے سلسلہ میں وہ عرصۂ دراز سے ہمارے خاندان کے گھروں میں ہنگامی صورتحال کے دوران بروقت خدمات سرانجام دیتے چلے آئے ہیں، اس لئے بوقتِ ضرورت ہم بے اختیار انہی کو یاد کرتے ہیں۔

؎ لوٹ جاتی ہے ادھر کو ہی نظر کیا کیجئے

حسبِ توقع کچھ ہی دیر کے بعد بشیر میاں بمع ساز و سامان کے آن پہنچے۔ انہوں نے بغور تالے کا معائنہ کیا اور اس کی سرکشی کا سدِ باب کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔

انہوں نے اپنی زنبیل میں سے ہتھوڑا نکالا، اسے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر تولا اور نشانہ باندھ کر تالے پر ضرب کاری رسید کی۔ تالا اس تابڑ توڑ حملے کی تاب نہ لا سکا اور ٹوٹ گیا۔ یوں نافرمان اور ناہنجار تالا کیفرِ کردار کو پہنچا۔

میرے میاں کو پھولوں اور پودوں سے والہانہ عشق ہے۔ اگر وہ جاگ رہے ہوں تو کھلی آنکھ سے پھول پودوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور نیند میں اگر وہ زیرِ لب مسکرا رہے ہوں تو میں جان جاتی ہوں کہ تب بھی وہ خواب میں ایسے ہی کسی منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ وہ بصد شوق بازار سے پھولوں کی کچھ فریم شدہ تصویریں خرید کر لائے تھے کہ انہیں گھر کے کمروں میں دیواروں پر لٹکا دیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح باہر بلا سے کیسا ہی موسم رہے، گھر کے اندر مستقل بہار کا سماں بندھا رہتا ہے۔

یہ تصویریں گھر کے ایک کونے میں رونمائی کی منتظر تھیں۔ میں نے بشیر میاں سے کہا کہ وہ دیواروں کے نشان زدہ حصوں میں کیل پیوست کر دیں تا کہ انہیں دیواروں کی زینت بنا دیا جائے اور یوں میرے میاں کا دل باغ و بہار ہو جائے۔ جونہی انہوں نے دیوار پر کیل رکھ کر اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی، ریت کے بے شمار ننھے منے ذرے دیوار سے نکل کر زمین بوس ہو گئے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے حیرت سے کہا ''ہائیں! یہ کیا''؟

میں نے پوچھا

''بشیر میاں! کیا ہوا''؟

کہنے لگے

''بھئی یہ گھر تو بہت بودا نکلا۔ یعنی دیواروں کی چنائی میں مصالحے کا تناسب مناسب نہیں۔ سیمنٹ چونکہ مہنگا ہے۔ اس لئے مصالحے میں اس کی مقدار ضرورت سے کم رکھی گئی ہے اور ریت چونکہ نسبتاً سستی ہے، اس لئے اس کی مقدار بڑھا دی گئی ہے۔ یہ تو بددیانتی ہے، صریحاً بددیانتی''۔

میں نے کہا

''آپ کا مطلب ہے کہ اس کی تعمیر میں سراسر خرابی کی صورت مضمر ہے''۔

کہنے لگے

''بالکل صحیح، اس کی اٹھان مضبوط نہیں''۔

پھر گھر کے در و دیوار پر اچٹتی ہوئی تنقیدی نظر ڈال کر پوچھنے لگے

''کیا اس گھر کی چھت تمہاری ملکیت میں ہے''؟

میں نے کہا

''نہیں! چونکہ یہ فلیٹ ہے، اس لئے اس کی اوپر والی منزل پر ہمارا کوئی حق نہیں وہاں ایک اور خاندان آباد ہے اور ہم چھت سمجھ کر جسے احترام سے اپنے سروں پر اوڑھے بیٹھے ہیں، وہ اسے فرش کہہ کر اپنے قدموں کے نیچے روندتے ہیں۔ یعنی ہم ان کے قدموں تلے بسیرا کئے ہوئے ہیں''۔

بشیر میاں بیچارے دیواروں کے مصالحے کی تاریخی حقیقت کو جان کر افسردہ تھے، اب میرے جغرافیائی انکشاف کو سن کر مزید رنجیدہ ہو گئے۔

کہنے لگے

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یعنی گھر کی تعمیر بھی انتہائی ناقص ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ چھت بھی غیروں کے قبضے میں ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم نے ایسا خسارے والا سودا کیونکر کیا کاش یہ گھر خریدنے سے پہلے تم کسی سیانے آدمی سے مشورہ کرلیتیں تو اس کی نوبت نہ آتی''

میں نے کہا

''بشیر میاں! چونکہ میں خود عقل سے تہی ہوں اس لئے مجھے بروقت کسی سیانے سے رہنمائی حاصل کرنیکا خیال کیونکر آتا۔ ویسے بھی میری تقدیر میں یہی گھر لکھا تھا، اس لئے ہر صورت مجھے یہی ملنا تھا، سو مل گیا''۔

وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔

''بی بی! ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس گھر کو بیچ کر کسی مناسب علاقے میں دوسرا گھر لے لو''۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے مختلف علاقوں کی خصوصیات اور گھروں کے نقشہ جات وتفصیلات بتانے لگے۔

میں نے پوچھا

''بشیر میاں! آپ جہاندیدہ آدمی ہیں اور آپ کو اپنے کام کا طویل تجربہ بھی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ آیا یہ گھر مزید پندرہ بیس سال تک کام دے جائے گا؟''۔

جونہی میں نے ان کے علم اور تجربے کا برملا اعتراف کیا، وہ پھرتی سے اٹھے اور دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھنے لگے۔ پھر دروازوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا تو اس انکشاف نے انہیں مزید آرزدہ کر دیا کہ دروازے ٹھوس لکڑی کے بجائے ہارڈ بورڈ اور پلائی سے بنے ہوئے تھے۔ گھر کے اندرونی معائنے کے بعد وہ ایک محقق کے انداز سے گھر سے نکلے اور باہر سے اس کے گوشے گوشے کا بنظر غائر جائزہ لے کر لوٹ آئے۔ پھر اپنی سائنسی تحقیق وتفتیش کو بڑے اعتماد کے ساتھ پیش

کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''میرے اندازے کے مطابق یہ گھر بآسانی پندرہ بیس سال نکال جائے گا لیکن کسی گھر کیلیئے بھلا یہ بھی کوئی مدت ہے۔ میری مانو تو گھر بدل ڈالو''۔

میں نے کہا

''بشیر میاں! اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ میرے اندازے کے مطابق اگر میں نے بہت جی لیا تو بھی شاید زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سال زندہ رہ پاؤں گی پھر مجھے اس گھر کی قطعاً ضرورت نہ ہوگی۔ میرے بعد یہاں بلا سے بوم رہے یا ہما بسے''۔

میرا فیصلہ سن کر انہوں نے بآوازِ بلند لاحول پڑھا۔ پھر طنزیہ انداز میں پوچھا

''کیا بچے تمہارے اپنے ہیں''؟

میں نے کہا

''ہاں الحمد اللہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ بچے میرے اپنے ہیں لیکن آپ نے یہ سوال کیوں پوچھا''؟

قدرے تلخی سے کہنے لگے۔

''تم عجیب ماں ہو کہ ان کے مستقبل کی کوئی فکر ہی نہیں۔ عقلمند والدین اپنے بچوں کی آسانی کیلیئے کیسی کیسی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور اپنے پیچھے ان کے لئے جائیداد وغیرہ چھوڑ جاتے ہیں تاکہ ان کو دقت نہ ہو۔ حیرت ہے کہ تم نے اپنے بچوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچا''

میں نے کہا

''بشیر میاں! یہ گھر مجھے میرے والدین نے نہیں دیا بلکہ یہ گھر تو میرے ربِّ کریم کی طرف سے ملا ہے۔ شکر ہے کہ وہ ہمہ وقت اپنی مخلوق کی ضروریات کا مسلسل باریک بینی سے جائزہ لینے والا ہے۔ اور شکر ہے کہ اس کے پاس گھروں کی کوئی کمی نہیں اور شکر ہے کہ وہ بے حد کریم اور فیاض ہے اور شکر ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اگر آج اس نے مجھے یہ گھر دیا ہے تو کل میرے بچوں کو بھی ہرگز محروم نہ رکھے گا۔ اس لئے

؎ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

☆☆☆

عظمیٰ ابونصر صدیقی

# کالی چادر

''اف! بس بھی کرو کیا مقابلہ حسن میں جا رہی ہو؟'' مروہ نے گزشتہ ایک گھنٹے سے آئینے کے سامنے تیار ہوتی نغمہ کو ٹوکا۔

''ارے! اتنے سارے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی چلی جاؤں گی تو سب کیا کہیں گے؟ یہی تو موقع ہوتا ہے جب سب ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے ہوتے ہیں۔'' نغمہ کہہ کر پھر آنکھوں کے میک اپ میں جت گئی۔

''کوئی نہیں...... سب خواتین تو اسی پریشانی میں ہوتی ہیں کہ پتہ نہیں میں کیسی لگ رہی ہوں؟ خود سے فرصت ملے تو دوسرے کو دیکھیں۔'' مروہ طنزیہ ہنسی۔

''تو اس کا مطلب ہے تیار ہو کر نہ جائیں، اب سب تمہاری طرح بوڑھی روح تو ہیں نہیں کہ خود چھپ کر بیٹھ جاؤ اور دوسروں کے تیار ہونے پر جلتی کڑھتی رہو۔'' مروہ کو فوراً جواب ملا۔

''میں سب کی بات نہیں کر رہی سسٹر...... تمہاری بات کر رہی ہوں کہ تمہیں تو ویسے ہی اللہ تعالیٰ نے اتنی فرصت سے بنایا ہے، بالکل ناول کی ہیروئن کی طرح...... اب تم اتنا تیار ہو کر جاؤ گی تو نہ جانے کتنے دل رک جائیں گے۔'' مروہ نے اپنی تمام کتابیں ایک طرف کیں اور کھڑی ہو گئی۔

''تو میری سسٹر...... جب اللہ نے اتنا حسن دیا ہے تو اس کو چھپانے سے کیا فائدہ؟ وہ کل ٹی وی میں اشتہار جو آرہا تھا...... کیا تھا وہ جملہ...... ہاں یاد آیا جب کچھ نہیں ہے چھپانے کو تو بہت کچھ ہے دنیا کو دکھانے کو......'' نغمہ نے رخ موڑتے ہوئے بالکل ماڈل کی طرح ایکٹ کیا۔

''تو اب اس کا مطلب ہے کہ......'' اس سے قبل کہ مروہ بولتی نغمہ نے بات کاٹ دی۔

''اس کا مطلب کہ حسن چھپانے کی چیز نہیں...... اسی کی دوڑ ہے اسی کی مانگ ہے، جس کو دیکھو حسین بننے کے چکر میں ہے۔ ٹی وی کھول کر دیکھ لو خواتین کے بیوٹی گائیڈ اشتہارات سے بھرا پڑا ہے اور مرد بیچاروں کے لئے موبائل ہی موبائل کے اشتہارات...... کچھ سمجھ

آئی؟'' نغمہ نے اس کے سر پر انگلی سے کھٹ کھٹ بجائی اور خود پر پرفیوم اسپرے کر کے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

مروہ، نغمہ کی چچا زاد تھی جو کراچی یونیورسٹی میں آخری سال کی طالبہ تھی، آج کل اس کے سمسٹر ہو رہے تھے اور اسی تعلیم کے باعث وہ حیدرآباد سے کراچی اپنے چچا کے گھر رہنے آئی ہوئی تھی، ان کے گھر کا ماحول تعلیم یافتہ تو تھا مگر آزادانہ نہ تھا، گھر سے نکلتے وقت خود کو چھپا کر نکلنے کی تلقین اس کی امی نے شروع سے ہی کی اور یہاں نغمہ اور چچی جان کا اس طرح آزادانہ نکلنا اسے ذہنی تناؤ کا شکار کر دیتا تھا، اس لیے وہ عموماً ان کے ساتھ جانے سے گریز ہی کرتی تھی، لیکن گھر میں نغمہ کے ساتھ اس کی بہترین دوستی تھی بس اسی بات پر اختلاف ہو جاتا تھا، نغمہ ایک پرائیویٹ کالج میں سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھی لیکن عمر کا یہ فرق بھی ان دونوں کی بے تکلفی میں محسوس نہ ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

آج تو شادی ختم ہو جائے گی ناں؟'' مروہ صبح کے لئے اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔

''ہاں آج ولیمہ ہے، تم چلو ناں......'' نغمہ نے اسے بھی پیشکش کر دی۔

''ناں بابا ناں......'' مروہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''مجھے تو باز ہی رکھو اس فیشن شو سے۔ اور وہ بھی اتنا ہائی کلاس۔''

''تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے سب تمہیں کھا جائیں گے۔'' نغمہ ہنسی۔

''ہاں تو اور...... جب ہر قسم کے مردوں کی الٹی سیدھی بھوکی نظریں ہم پر پڑتی ہیں تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے بس کھانے ہی والے ہوں۔'' مروہ نے منہ بنایا۔

''پتہ نہیں تم لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہو یہ بھوکی نظریں......؟'' مروہ کی بات سن کر نغمہ کو بے اختیار وہ امیر زادہ یاد آیا جو ان کے اپارٹمنٹ کے مرکزی دروازے پر اپنی مرسڈیز سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور بے انتہا بھوکی نظروں سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نغمہ نے بے اختیار جھرجھری لی۔

''اوہو! چھوڑو ناں...... آج ویسے بھی امی بھی نہیں جا رہیں، میں بھی عاصم بھائی کے ساتھ بائیک پر جا رہی ہوں۔ تمہیں نہیں چلنا تو نہ چلو مگر ڈراؤ تو نہیں۔'' نغمہ نے کپڑے اٹھائے اور تیار ہونے چل دی۔

بے بی پنک پر سلور نگوں کے کام سے مزین جدید

تراش خراش کے سوٹ میں ہلکے گلابی میک اپ کے ساتھ نغمہ جب تیار ہوکر مروہ سے اس کا سلور نیکلس لینے آئی تو مروہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

''کیا ہوا؟'' نغمہ نے اس کے آگے ہاتھ لہرایا۔

مروہ نے اس کو سراہنے والی نظروں سے دیکھا'' نغمہ تم اتنی پیاری لگ رہی ہوں کہ میری ہی نظر نہیں ہٹ رہی، پلیز تم میری یہ چادر اوڑھ جاؤ۔''

''بس کردو...... مجھ سے نہیں سنبھلے گی بائیک پر چادر۔'' نغمہ نے چادر واپس بیڈ پر ڈال دی۔

''اچھا کم ازکم یہ زلفیں تو باندھ لو...... ورنہ آج تو کچھ ہوکر رہے گا مجھے عجیب سا ڈر محسوس ہورہا ہے۔''

''ارے کچھ نہیں ہوگا...... عاصم بھائی ہیں ناں ساتھ...... میں دوپٹہ اوڑھ لوں گی بس خوش۔''

''ہاں یہ شیفون کے دوپٹے میں ہی تو تمہارا سراپا چھپے گا؟! اوپر سے یہ ڈھیر سارا پرفیوم اور چھڑک لو......'' مروہ نے بے اختیار اس سے پرفیوم چھینا۔

''ارے آج پہلی بار تھوڑی لگا رہی ہوں...... حد ہوگئی۔ اچھا تم دروازہ بند کرلو، ابو بھی نہیں ہیں اور امی کی طبیعت بھی خراب ہے۔'' مروہ آیت الکرسی پڑھتی دروازے تک آئی جہاں عاصم کلف لگے سفید لباس میں تیار کھڑا تھا۔ دونوں بہن بھائی ہی ایک دوسرے سے بڑھ کر حسین ہیں۔ اس نے دونوں پر پھونک ماری نغمہ زور سے ہنس دی۔ ''اچھا بڑی بی اب دروازہ بند کرلو۔''

اپارٹمنٹ سے اتر جب وہ دونوں مرکزی دروازے کی طرف آئے تو نغمہ کو آج پھر وہ لڑکا اسی طرح اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں کھڑا گھورتا نظر آیا۔ اس لمحے اسے اپنے ہاتھ پسینے میں بھیگتے محسوس ہوئے۔

ارے میں تو بہت بولڈ ہوں کیا کرلے گا یہ گھور کر...... اس نے خود کو ڈانٹا اور اعتماد سے چلتی باہر آگئی جہاں عاصم کی بائیک کھڑی تھی۔ اسے اب بھی اپنی پشت پر دو انگارے جلتے محسوس ہوئے تو اس نے بے اختیار ہی دوپٹہ پھیلایا مگر یہ شیفون کا ہلکا گلابی دوپٹہ اسے چھپانے کے بجائے مزید ظاہر ہی کرگیا۔ عاصم نے موٹرسائیکل اسٹارٹ کی تو اسے کچھ سکون ملا لیکن پیچھے سے زوردار سٹی کی آواز نے عاصم بھائی کو مڑ کو دیکھنے پر مجبور کردیا۔

''بھائی! جلدی کریں ناں پہلے ہی اتنی دیر ہوگئی ہے۔'' نغمہ تیزی سے بول اٹھی۔

عاصم بھائی کو کہیں کام سے جانا تھا تو وہ جلدی ہی

ولیمہ میں سے واپس آ گئے، پلازہ کے مرکزی دوراز ے پر وہ خبیث لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ اب بھی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور شاید ان لوگوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ نغمہ کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خبیث مسکراہٹ آ گئی اور اس کے باقی دوست بھی نغمہ کی جانب دیکھنے لگے۔ عاصم بھائی نغمہ کو دروازے پر اتار کر واپس پلٹنے لگے کہ اتنی دیر میں ایک بے ہودہ گانا گانے کی آواز آئی، وہ فوراً ہی نغمہ کی جانب متوجہ ہوئے جس کا ہاتھ اس امیرزادے نے پکڑ لیا تھا اور نغمہ ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی جس کے نتیجے میں اسکی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر نیچے گر گئیں۔

''اے یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' عاصم چلا اٹھا اور تیزی سے آ کر لڑکے کو دھکا دیا۔ آس پاس اس لڑکے کافی دوست جمع ہو گئے۔

''تم فوراً اندر جاؤ میں دیکھتا ہوں ان کو۔'' عاصم نے نغمہ کو اپارٹمنٹ کے دروازے پر دھکیلا۔

''بھائی!...... وہ بہت سارے ہیں۔'' نغمہ نے آنسو بھری آنکھوں سے بھائی کو دیکھا۔

''اب بولو کیا مسئلہ ہے؟ تمہاری ماں بہن نہیں ہیں کیا؟'' عاصم نے اس لڑکے کا گریبان پکڑ لیا۔

''چھوڑو گریبان کو......'' پیچھے سے دولڑکوں نے عاصم کو الگ کیا۔

امیرزادے نے اپنے کپڑے جھاڑے اور بولا ''اسفند یار کو جو چیز پسند آتی ہے وہ اسے حاصل کر لیتا ہے، تو کیا چیز ہے میرے سامنے ایک معمولی سے پولیس افسر کی اولاد؟ اور ایسے افسر تو ہر وقت ہماری جیب میں ہوتے ہیں پیسوں کی خاطر دم ہلاتے ہوئے۔''

اپنی بہن اور والد کے بارے میں اسفند کی باتوں نے اسے جلال کی انتہا پر پہنچا دیا۔ ''چھوڑو مجھے میں ابھی بتاتا ہوں کہ تم کیا چیز ہو؟'' عاصم نے ہاتھ چھڑائے اور اسفند کی جانب لپکا۔ جس کے ہاتھ میں جدید اسلحہ چمک رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں عاصم خون میں لت پت زمین پر پڑا جان کی بازی ہار چکا تھا۔

قرب وجوار کے بہت سے لوگوں نے عاصم کے قاتل کو اپنی آنکھوں سے جاتے دیکھا لیکن کسی میں آگے بڑھنے اور کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔ کیوں کہ وہ اسفند یار تھا ایک بہت بڑے جاگیردار باپ کا بگڑا ہوا سپوت......

نغمہ بار بار اپنے معصوم بھائی کی لاش دیکھتی اور بے ہوش جاتی۔ آج تک بہن بھائی کی خاطر قربانیاں دیتی آئی ہیں اور آج اس کے بھائی نے اس کے لیے قربانی دی تھی...... نغمہ سوچتی کہ عاصم کا قاتل صرف اسفند یار نہ تھا بلکہ میں بھی اپنے بھائی کی موت کی ذمہ دار ہوں جس کی وجہ سے یہ تمام واقعہ ہوا۔

وہ کس کس سے منہ چھپاتی کہ عاصم اس کے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، اور مروہ جسے کچھ عرصے بعد عاصم کے نام کی سند ملنے والی تھی، سکتے کی سی کیفیت میں کونے میں بیٹھی رہتی۔ انسپکٹر قاسم صاحب نے جوان بیٹے کی موت پر خاموش نہ بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور میڈیا کے ساتھ مل کر مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم کیا اور اس معاملے کو عدالت تک لے گئے، جہاں اسفند یار کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔

جاگیردار مہمند یار کو ہرگز توقع نہ تھی کہ معاملہ عدالت تک پہنچ جائے گا۔ انہوں نے فوراً اپنے بیٹے کو روپوش کر دیا جو کچھ عرصے بعد دوسرے ملک سے پکڑا گیا۔ اب جاگیردار مہمند یار نے دوسرے طریقے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

نغمہ کا گھر سے نکلنا بالکل بند ہو چکا تھا۔ اس کی والدہ کو اس کی جانب سے بہت سے اندیشے لاحق تھے۔ بیٹے کی موت کے بدلے انصاف کے دروازے کھلنے کے بعد ان تمام گھر والوں پر دنیا کے دروازے بند ہو چکے تھے، آخر کار اس ذہنی دباؤ اور مستقبل کے اندیشوں سے تنگ آ کر انہوں نے یہ ملک ہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور پھر انہی کے محلے والوں نے جنہوں نے بہت مشکل سے مجرم کے خلاف گواہی دی تھی یہ سنا کہ عاصم کے گھر والوں نے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیا ہے۔ یقیناً آخرت میں تو وہ اپنے کیے کا پھل ضرور پائے گا لیکن اس بہن کا کیا ہوگا جو ایک چادر قبول نہ کر کے اپنے جوان بھائی کی موت کی ذمہ دار بنی تھی۔ اور آج وہ گھر میں بھی اس کالی چادر کو اتارنے کی ہمت نہیں کر پاتی جو اس نے اپنے بھائی کی موت پر اوڑھی تھی مگر اب اس چادر کا کیا فائدہ......

☆☆☆

# روشنی

میں لاہور کے ایک پوش علاقے میں رہتی ہوں۔ اس علاقے کی خاص بات یہ ہے کہ دوسرے بڑے علاقوں کے برعکس یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ آپس میں ملتے ہیں، دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی زندگیوں میں بے جا مداخلت نہیں کرتے۔

میرے ساتھ والے گھر میں ایک خاتون رہتی ہیں، عمر ساٹھ پینسٹھ کے درمیان ہوگی۔ کچھ سال پہلے تو ان کا گھر بھرا ہوا تھا لیکن اب تنہا ہیں۔ بیٹیاں شادی ہو کر چلی گئیں اور بیٹے پڑھنے کے لئے باہر چلے گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ خیر یہ تو ہماری سوسائٹی میں ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ سب ہی لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس مسئلہ سے نبٹ رہے ہیں۔

تو میں آپ کو آنٹی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ مجھے ان سے ایک خاص انس ہے۔ کچھ ان کے خلوص کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ زندگی کو کس طرح سے برتتی ہیں۔ میں ان کی ہر چیز کو ہر عمل کو بڑی توجہ سے دیکھتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ ان جیسی کچھ صفات میرے اندر بھی پیدا ہو جائیں۔

ان کا گھر مجھے بہت پسند ہے، صاف ستھرا، روشن ہوا دار، ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے گھر میں بہت کم چیزیں ہیں لیکن جو کچھ بھی ہیں بہت اچھی اور ضرورت کی۔ سجاوٹ کی چیزیں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر لیکن جو ہیں وہ اپنے طریقے اور سلیقے سے رکھی گئی ہیں جیسے بیش قیمت انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہو۔

آنٹی نے غیر ممالک کے سفر بہت کیے ہیں اس لیے وہاں کے نوادرات ہیں جو انہوں نے ڈرائنگ روم میں سجائے ہیں۔ لیکن یہ بھی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ بس وہ اپنے اپنے علاقوں کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ گھر کا انداز ایسا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی امیر کا ہے یا غریب کا۔ یہاں ہر آسائش موجود ہے لیکن امارت کا بوجھل پن نہیں ہے۔ اور سٹائل ایسا ہے کہ کم ہی گھروں میں نظر آتا ہے۔

یہ تو ہو گیا تذکرہ مادی چیزوں کا۔ یہاں آنے والوں کو جو عزت، پیار، محبت، خلوص اور پذیرائی ملتی ہے

اس کی کوئی حد نہیں۔ یہاں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ امیر غریب، رشتہ دار، شاگرد، پڑوسی اور پرانے ملازم، سب ایک ہی طرح سے عزت اور محبت پاتے ہیں۔ آنٹی کا بس نہیں چلتا ہے کہ ان کے لیے اپنی جان بھی حاضر کر دیں۔

23 دسمبر کا دن تھا۔ میں ذرا تازہ ہوا لینے کے لئے باہر نکلی تو محسوس ہوا کہ آنٹی کے گھر میں کچھ گہما گہمی ہے۔ سوچا چلو دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ بیل دی تو ڈرائیور نے گیٹ کھولا۔ سامنے کا بڑا دروازہ بند تھا۔ میں کچن سے داخل ہوئی۔ دیکھا نذیراں چائے بنا رہی تھی۔ آگے بڑھی تو دیکھا لاؤنج میں کوئی آٹھ نو خواتین بیٹھی ہوئی ہیں اور آنٹی ان کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی ہیں۔ صورتحال کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ یہ خواتین وہ نہیں لگ رہی تھیں جن سے عام طور پر ہمارا ملنا ہوتا ہے۔ خیر میں ایک کرسی لے کر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ یہ اس ادارے کی صفائی کرنے والی خواتین ہیں جہاں آنٹی کا آنا جانا رہتا ہے۔

آنٹی ہر کرسمس کے موقع پر عیسائی برادری کو جو بھی ان کے آس پاس ہوں تحائف دیتی ہیں۔ اس بار مہنگائی کے پیش نظر انہوں نے راشن کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جس کا ڈھیر پورچ میں لگا ہوا تھا۔ آنٹی نے خاطر تواضع کے بعد انہیں راشن کے پیکٹ دیئے اور اس میں سب سے اچھی بات جو لگی وہ یہ تھی کہ آنٹی نے ہر صفائی والی کو گلے لگا کر پیار کر کے رخصت کیا۔

ایک دن میں آنٹی سے ملنے گئی تو لگا کچھ مہمانوں کیلیئے تیاری ہو رہی ہے۔ بڑی توجہ سے خود ٹرالی سیٹ کر رہی تھیں۔ میں نے پوچھا ''کون آ رہا ہے؟''

کہنے لگیں ''خود ہی دیکھ لینا بلکہ بیٹھو ہمارے ساتھ ہی چائے پینا۔''

خیر تھوڑی دیر بعد مہمان آ گئے۔ دو گورے چٹے خوبرو جوان پینٹ کوٹ اور ٹائی میں ملبوس اور ساتھ دو خوبصورت لڑکیاں جدید لیکن مناسب کپڑوں میں ملبوس۔ تعارف ہوا پتہ لگا آنٹی کے شاگرد ہیں۔ جڑواں بھائی ہیں عدیل اور شکیل اور ساتھ دونوں کی بیویاں ہیں۔ باتوں باتوں میں معلوم ہا کہ دونوں بھائی بڑی کمپنیوں پر بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔

مہمانوں کی طرف سے جس عقیدت کا اور آنٹی کی طرف سے جس محبت کا اظہار ہو رہا تھا وہ بے مثال تھا۔ اس مادی دنیا میں یہ جذبے میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ خیر تھوڑی دیر بعد مہمان رخصت ہوئے۔ آنٹی نے مجھے

روک لیا کہ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو جاؤ۔ خیر ہم نے مزید چائے منگوائی اور آنٹی نے بتانا شروع کیا کہ یہ بچے جو آئے تھے ان کے والد کسی سرکاری دفتر میں چپڑاسی تھے۔ میری کسی کام کے سلسلے میں اس شخص سے جان پہچان تھی۔ اس شخص کے بہت سارے بچے تھے۔ بڑا بیٹا اسی کی طرح چپڑاسی تھا لیکن آخری چاروں بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی۔ ان بچوں کی میں نے ہر طرح اعانت کی۔ انکو خود پڑھا کر میٹرک کروایا۔ اس کے بعد کالج میں داخل کروایا۔ فیس دینے اور تمام اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خبر گیری بھی کرتی تھی۔ کالج جا کر پتہ کرتی اور جہاں ضرورت ہوتی ان کو پڑھاتی بھی تھی۔ انہیں شہر کے ایک مشہور کالج سے بی کام کروایا، اس کے بعد چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے انہوں نے ایم بی اے کرلیا۔ باقی نتائج تو اب آپ کے سامنے ہیں۔ ایک چیز بہت اہم ہے، آنٹی نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

میری مدد اور مالی اعانت تو تھی ہی لیکن ہم ان بچوں کی محنت اور لگن کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔

آنٹی کا کہنا تھا کہ ہمارا فرض، ہماری ذمہ داری صرف پیسے دے کر پوری نہیں ہو جاتی۔ ہمیں ان کا مقصد زندگی بنانے اور اس کے حصول میں بھی مدد کرنی ہوگی۔ پاکستان میں پیسہ دے کر غریبوں کی بہت مدد کی جا رہی ہے جس سے ان میں دو چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایک پیسے کا غلط استعمال اور دوسرے ہاتھ پھیلانے کی عادت۔ اور یہ دونوں چیزیں اسلام میں ناپسندیدہ ہیں۔ ہم پر ان کے کردار کی بلندی کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ ہم ان کی مدد کریں تو ان کے اندر عزت نفس پیدا کرنا بھی ہمارا کام ہے۔

اب آنٹی بولنے کے موڈ میں تھیں کہنے لگیں ''آپ کو ہر بچہ پڑھنے والا نہیں ملے گا۔ کچھ بچوں کا دھیان پڑھائی کی طرف نہیں ہوتا۔ انہیں ہم آوارہ پھرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتے۔ اپنی عزت اور صحیح تربیت کے ساتھ مختلف ہنر سکھا سکتے ہیں جس سے یہ گھر کے ذمہ دار فرد اور پاکستان کے بہترین شہری بن سکتے ہیں۔''

میں نے آنٹی سے اجازت چاہی، اس عزم کے ساتھ کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ایک بچے کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں مدد کروں گی۔

☆☆☆

# میری داستانِ حسرت

''اُف آج پھر آلو، یہ آپ ہر روز آلو پکا کر کیا ان سے جذبہ خیرسگالی کا اظہار کرتی ہیں یا انہیں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں؟'' اِرما نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے جب ڈشوں پر سے ڈھکنے ہٹاتے ہوئے ان میں جھانکا، پھر حسب معمول ان میں آلوؤں کو براجمان دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔

''ہائیں! کیا کہہ رہی ہو۔'' امی کے خاک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ آخر آپ روزانہ آلو کیوں پکاتی ہیں؟'' اب کے اس نے سیدھے سادھے آسان لفظوں میں احتجاج کیا تھا۔

''کیونکہ تمہارے بھائیوں کو پسند ہے۔'' امی نے لاپروائی سے جواب دیا اور وہ وس بے اعتنائی پر سر تھام کر ہی تو رہ گئی۔

''لیکن میرے خیال سے آپ کے لاڈلوں کے علاوہ میں بھی اس گھر میں رہائش پذیر ہوں۔''

''ہاں ہو، تو؟''

''تو یہ کہ مجھ حقیر پُرتقصیر کی پسند کو کیوں نہیں مدنظر رکھا جاتا۔'' وہ بلبلائی۔

''یہ تم اپنی بات آسان لفظوں میں نہیں کہہ سکتیں۔''

''آسان یہ کہ میں آلوؤں سے عاجز آچکی ہوں۔ ہفتے کے سات دنوں میں سے چھ دن ہمارے گھر آلو پکتے ہیں اور ساتویں دن اس لیے نہیں پکتے کہ اس دن ہم گھر میں نہیں ہوتے ورنہ اس دن بھی آلو گوشت، آلو مٹر، آلو ٹماٹر، آلو قیمہ، آلو کے کٹلس، آلو چاول، آلو گوبھی، آلو بینگن میں سے ہی کچھ پکے اور تو اور آلوؤں کی کھیر بھی اسی گھر میں پکتی ہے، کیا ظلم ہے۔''

''بہت خوب، کیا شکر گزاری کی جارہی ہے اللہ کی، یہ سب تمہیں پکا پکایا مل جاتا ہے نا اس لیے۔ اور کیا آلو کی کھیر بدمزہ ہوتی ہے، خود جب کچن سنبھالو گی نا تب پتہ چلے گا۔'' امی بیزار تھیں۔

''میں منتظر ہوں اس دن کی جب کچن کا مکمل استحقاق میرے ہاتھ میں ہوگا۔ کاش وہ دن جلد آئے اوران آلوؤں سے چھٹکارا ملے۔ پھراس گھر میں بھی مزے مزے کے کھانے پکیں گے۔''

''کیوں اب نہیں پکتے؟''امی نے تنک کر پوچھا۔

''آلو کے بغیر کھائیں گے تو کھانے کا مزہ محسوس ہوگا۔ مجھے تو اب چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، سوائے آلوؤں کے کچھ نظر نہیں آتا۔''

''اچھا اچھا اب تم زیادہ مبالغہ آرائی نہ کرو۔''امی نے بات کاٹی۔

''سچ کہہ رہی ہوں پچھلے تین دنوں سے خواب میں بھی آلو دیکھ رہی ہوں کہ میں ایسے کھیت میں ہوں جہاں ہر طرف درختوں میں آلو لگے ہوئے ہیں اور آپ ان آلوؤں کو توڑ توڑ کر گاڑی میں بھر رہی ہیں۔ اور کل تو میں نے آپ کو آلو کا حلوہ بھی بناتے ہوئے دیکھا، اُف کیا خوفناک خواب تھا۔''

ہائیں آلو، درختوں پر، لیکن آلو تو زمین کے اندر ہوتا ہے اور آلو کا حلوہ، کیا بات ہے، یہ خواب تو تمہارا سچا نکلا۔''

''کیا مطلب؟''

''کیونکہ آج میں نے سچ مچ حلوہ پکایا ہے۔''

''سوجی کا؟''

''نہیں آلو کا۔''

''نن نہیں۔''وہ بے ہوش ہونے کو تھی۔

''ارے جیسے گاجر کا، لوکی کا، چنے کی دال وغیرہ کا حلوہ پکتا ہے ایسے ہی آلو کا بھی، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔''

''یہ تعجب کا نہیں بلکہ بلکہ......ڈوب مرنے کا مقام ہے۔''

''کس کے تمہارے؟''

''جی نہیں آلوؤں کے، کہ ان پر ایسا وقت بھی آنا تھا۔''اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شہر بھر سے آلوؤں کو کہیں غائب کرادے۔

''اچھا بہت ہوگئیں بے کار باتیں اب کھانا کھاؤ۔''

''کھانا نہیں، آلو۔''وہ منہ میں بدبدائی، لیکن امی نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

اگرچہ وہ اکلوتی بیٹی تھی اور اس سے بڑے چھوٹے تین بھائی تھے لیکن تینوں ہی آلوؤں کے عشق میں گرفتار

اور امی بیٹوں کے عشق میں، گھر میں شاذونادر ہی آلو کے بغیر کھانا پکتا تھا اور وہ دن اِرما کے لیے عید کا دن ہوتا۔ گھر میں ہر ہفتے آلو کی بوری ابو لے آتے کیونکہ وہ منڈی میں سبزی اور پھل کے سپلائر تھے۔ چونکہ ان کی سوچ یہ تھی کہ کھانے کے لئے زندہ نہیں رہنا بلکہ زندہ رہنے کیلئے کھانا ہے لہٰذا وہ بغیر کسی چوں چراکے کھانا کھاتے اور ویسے بھی وہ بڑے قناعت پسند اور صابر انسان تھے۔ سبزی اور پھلوں کے درمیان رہتے رہتے ان کے لئے ہر سبزی پھل ایک سا ہی ہو گیا تھا۔ اب لے دے کر گھر میں صرف اِرما ہی بچی تھی جو کھانوں پر اعتراض کرتی لیکن امی اس کے اعتراضات کوناک پر سے مکھی کی طرح اڑا دیتیں۔

☆......☆......☆

''گھر میں آلو ختم ہو رہے ہیں کل لیتے آیئے گا۔'' ابو کے گھر میں آنے کے بعد امی نے ابو کو یاد دہانی کروائی۔

''ارے بیگم آلو کا تو نام نہ لو، آلو پیاز، دونوں پر بڑی آفت آئی ہوئی ہے۔''

''ہائیں آلو جیسی عام سبزی پر بھلا کیا آفت آ گئی جو سال کے بارہ مہینے ہر دکان پر ٹھیلے پر ملتی ہے۔ اور بڑی آسانی سے ملتی ہے۔ آفت تو ان ہرے، لال ٹماٹروں پر آتی ہے جو کبھی 20 روپے ہوتے ہیں تو کبھی 200 روپے پر پہنچ جاتے ہیں۔ سارا سال قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہی رہتا ہے لیکن یہ آلو تو بڑی مسکین سی سبزی ہے۔'' امی تو نان سٹاپ شروع ہو گئی تھیں۔

''اوہو! تم تو بولتی ہو تو...... بس آج کل ٹماٹر، پیاز، ادرک، لہسن کے ساتھ آلو کی بھی قلت ہو رہی ہے، چاہے مصنوعی ہی سہی، پیچھے سے ہی یہ سب ہو رہا ہے۔ اب میں تم کو کیا تفصیل سے سناؤں، بس چند دن ٹھہر جاؤ، میں دوسری سبزیاں لایا ہوں وہی پکالو۔'' ابو جھلاتے ہوئے بولے۔

''ارے بغیر آلو کے آپ کے لاڈلے کہاں کھاتے ہیں۔''

''سب کھالیں گے، ان کو عادت تو ڈالو، خواہ مخواہ کے نخرے۔'' وہ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے بولے۔

امی تو یہ سب سن کر سوچ میں پڑ گئی تھیں لیکن جب اِرما تک یہ بات پہنچی تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا خوشی کے مارے سارے محلے میں مٹھائی بانٹے، بینڈ باجے بجوائے یا بھنگڑا ڈالے یا پھر ایک ایک سہیلی کو بذریعہ ایس ایم ایس اپنی خوشی میں شریک کرے۔ گھر میں چند

دن آلوؤں کا نہ پکنا اس کا خواب تھا پورا ہوا جاتا تھا۔

اور پھر گھر میں گوبھی، بھنڈی، اروی پکنے لگی۔ قیمہ بغیر آلو کے کیسا ہوتا ہے یہ اب پتہ چلا تھا۔ چند دن تو لڑکوں نے ناک بھوں چڑھایا لیکن پھر وہ بھی شاید عادی ہونے لگے تھے۔ اور شاید وہ عادی ہو ہی جاتے کہ قلت ختم ہوئی اور اِرما کی عارضی خوشی اپنے اختتام کو پہنچی۔

آج ابو گھر آئے تو ان کے ساتھ کئی چیزوں کے علاوہ حسب سابق آلو کی بوری بھی تھی۔

ایک دفعہ پھر پچھلا روٹین چل نکلا تھا۔ لیکن اس دفعہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ لڑکے خود فرمائش کر کے دوسری سبزیاں بھی پکانے کو کہتے، جس پر امی تو امی، اِرما بھی حیران تھی اور اس کا سارا کریڈٹ اس مصنوعی قلت کو دیتی جس کی بدولت اس کے گھر میں بھی مختلف قسم کی سبزیاں پکیں اور گھر والے نئے ذائقوں سے روشناس ہوئے۔

اب وہ ایسے کھانے پکاتی جس میں دور تک آلو کا نام ونشان بھی نہ ہو۔ نہاری، قورمہ، کڑاہی، کوفتے، وہ جان بوجھ کر بھائیوں کو ایسے کھانوں کا عادی بنا رہی تھی اور آلو کے بغیر کھانا کھانے کی اپنی حسرت پوری کر رہی تھی اور اس طرح کرنے سے بھائیوں سے زیادہ امی چیں بہ چیں ہوتیں کیونکہ اِرما ان کا بجٹ کا توازن بگاڑ دیتی۔

اِرما کو خوش ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ابو کے ایک بہت ہی عزیز دوست کی فیملی ان کے گھر کچھ دن رہائش پذیر ہونے کو آئی تھی۔ بیوی صاحبہ اور دو عدد شرارتی بچے۔ بیوی صاحبہ کے جونخرے تھے سو تھے لیکن بچے تو ان سے دو ہاتھ آگے تھے۔ سب سے پہلے تو انہیں اس کمرے پر اعتراض ہوا جو ان کی عارضی رہائش تھا۔ جلدی جلدی اس کی ترتیب تبدیل کی گئی۔ کچھ اعتراض اس علاقہ پر بھی تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر اعتراض کھانے پر ہوا۔ پہلے دن ان کے لئے کھانے پر خاص اہتمام تھا۔ یہی صورتحال دوسرے دن بھی رہی لیکن تیسرے دن ان کی طرف سے آنے والا جملہ معترضہ اِرما کو حیران پریشان کر گیا۔

''آپ کے گھر میں آلو نہیں ہوتے؟ میرے بچے تو بغیر آلوؤں کے کھانا ہی نہیں کھاتے اور میں تو خود آلوؤں کی دیوانی ہوں۔ پچھلے دو دن سے ہم تینوں نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔'' وہ شکایتی انداز میں کہہ رہی تھیں۔

’’ارے واقعی! آپ کو آلو پسند ہیں؟ میرے گھر کلو دو کلو نہیں بلکہ بوری بھر آلو آتے ہیں۔ آپ کو ایسے ایسے مزیدار کھانے کھلاؤں گی کہ آپ انگلیاں چاٹتی رہ جائیں گی۔‘‘ امی جواب میں مہمان آنٹی سے اور بھی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں لیکن ارما کے تو آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

☆☆☆

یونس جاوید

# دستک

یہ کہانی ٹیلی ویژن پر بھی پیش کی جا چکی ہے تاہم اتنی اچھی کہانیاں پڑھی بھی جاسکتی ہیں

شاید پھر دستک ہوئی تھی۔ تین مرتبہ ایسا ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے، میری بیوی تو اس دستک سے الرجک تھی۔ خدا جانے! قصور میرا تھا یا نہیں، مگر وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں قصوروار ہوں۔

پہلی مرتبہ...... ہاں پہلی مرتبہ......مگر یہ تو کئی روز پہلے کی بات ہے۔ وہ مجھے گلی میں ایک تھڑے پر بیٹھا نظر آیا تھا۔ شاید پاگل تھا لیکن میں نے اس کے بارے میں زیادہ سوچا نہیں تھا، میرے گزرنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا، پھر چلنے لگا۔ بالکل میرے پیچھے پیچھے، مکان کے دروازے تک!

''کیا ہے؟'' میں رک گیا۔ وہ خاموش رہا۔ میں اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اسکے فوراً بعد میں نے دستک سنی۔ یہ پہلی دستک تھی۔

میں نے بیوی کو آواز دی۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔ جواب دینے کی بجائے میں نے کھڑکی کھولی۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تو پھر؟'' مجھے برا لگا۔

''میں زخم زخم ہوں۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' بیوی پوچھ رہی تھی، پھر وہ خود ہی بولی ''شہر میں جاؤ نا، ڈسپنسری میں!''

''سارا شہر نمک کا ہے۔'' اس کے لہجے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں تھی۔

''سارا شہر نمک کا ہے۔'' بیوی نے دہرایا۔ ''تمہارے پلے کچھ پڑا؟ مجھے تو تو پاگل ہی لگتا ہے یہ۔''

''ہاں، شاید۔'' رک کر میں نے اس سے پوچھا ''کیا چاہیے تمہیں؟''

''حرارت! مجھے حرارت چاہیے۔'' اس کے لفظ یہی تھے۔ ہاں یہی تھے۔

''حرارت چاہیے؟'' عجیب سا لگا مجھے۔

''جی ہاں۔'' وہ مصر تھا۔

''تو میں کیا کروں؟'' میں چڑ گیا تھا۔

''دھوپ میں بیٹھو جا کر۔''

''کوئی گرم کپڑا!'' وہ رک گیا۔

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔''مگر اس وقت کچھ نہیں ہوسکتا،کل آنا۔'' میں نے لمحہ بھر میں دیکھ لیا تھا کہ وہ سچا ہے۔اس نے صرف ایک قمیض پہن رکھی تھی،میلی ،پھٹی ہوئی،آستینوں تک لیر لیر! کلائیوں کی نیلی رگیں پھول رہی تھیں اور جلد کا رنگ نہ جانے کیا تھا۔میں نے کھٹ سے کھڑکی بند کردی واقعی بہت سردی تھی، کھڑے کھڑے میرے گھٹنے سن ہوگئے۔

بحال ہونے کے بعد میں نے بیوی سے کہا''واقعی بہت سردی ہے۔کوئی کپڑ وپڑا تلاش کردینا۔''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں،اٹھ کر باہر نکل گئی۔

میں نے سوچا، یہ کام میں خود ہی کیوں نہ کرلوں! میں نے تلاش شروع کردی،مگر عجیب الجھن تھی،ہر کوٹ کے ساتھ کوئی نہ کوئی یادوابستہ تھی،ٹائی کی شکل میں! اور ٹائیاں مجھے بہت پسند ہیں۔عیسیٰؑ کی صلیب کا نشان! ہوسکتا ہے،قبل ازمسیح بھی ان کا رواج ہومگر میری مشکل یہ تھی کہ ٹائی میرے کسی نہ کسی دوست، بے حدعزیز کی طرف سے گفٹ تھی اور کسی نہ کسی کوٹ کے ساتھ میچ تھی لہٰذا کوئی بھی کوٹ نہ ملا۔

اصل میں کوئی پھٹا پرانا کوٹ تھا ہی نہیں۔

بس،یہی میرا قصور تھا۔

بیوی کہتی کہ اگر اس شخص سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو اس طرح بار بار دستک دے کر تنگ تو نہ کرتا۔

مگر یہ کوئی دلیل تھی بھلا! ہم دن میں کتنے وعدے کرتے ہیں،توڑتے ہیں۔ ہر لمحے کے ساتھ ہماری حیثیت بدل جاتی ہے، ابھی باس تھے، ابھی ماتحت ہوگئے،کبھی باپ بھی! ہر لمحے بات تو بدلنا ہی پڑتی ہے۔ ایٹی کیٹس اور منیرز تو یہی ہیں۔

مگر وہ مجھے قصوروار ٹھہراتی تھی۔بیویاں عموماً جھگڑالو ہوتی ہیں۔

''تم جھگڑالو ہو'' میں نے چلا کر کہا۔''شادی کے بعد تم پر روپ اور مجھ پر قرض چڑھا ہے اور تم ہو کہ......''

اب کے چوتھی دستک تھی! بیوی گھٹ کر رہ گئی۔

''کون ہے؟'' جانتے ہوئے بھی پوچھنا ضروری تھا۔

''میں ہوں۔'' آواز وہی تھی۔

''کہہ دیا نا کہ پھر کسی وقت آنا۔'' میں نے پیچھا

چھڑانا چاہا۔

''مجھے اندر آنے دیجیے باہر بہت ٹھنڈ ہے۔''

''اندر آنے دوں۔'' میں نے کھڑکی کھول کر کہا۔''کمال ہے! جان نہ پہچان، اندر آنے دوں! کون جانتا ہے تمہیں اس محلے میں؟''

''آپ جانتے ہیں مجھے۔'' وہ بولا۔

''میں؟'' مجھے حیرت ہوئی۔''میں تو نہیں جانتا، تم ہو کون؟''

''آدمی!'' وہ بہت آہستہ سے بولا تھا۔

''آدمیوں والے کام بھی تو کرو۔'' میرا سارا غصہ کھڑکی بند کرنے میں نکل گیا تھا۔

''احمق۔'' بیوی بڑبڑائی۔

''کم بخت۔'' میں نے دانت پیسے۔

مگر اس نے پھر دستک دے دی۔

''کیا ہے؟'' میں جھلا گیا تھا، وہ کچھ نہ بولا، صرف تکنے گیا میری طرف، گم صم! میں نے ماچس باہر پھینک دی۔''اٹھاؤ۔'' میں نے کہا''تنکے وتنکے جمع کر کے آگ جلالو۔''

''تنکے؟'' وہ اس ایک لفظ پر رک گیا تھا۔ وہ کھڑا رہا۔ میں نے کھڑکی بند نہیں کی۔ وہ بالکل پاگل لگ رہا تھا۔

''جاؤ نا اب! مجھے سونے دو۔ دیکھو سنو!'' میں نے کھڑی انگلی سے اسے دھمکایا۔''اب اگر دستک دی نا تو...... سمجھے...... تو میں نمٹ لوں گا تم سے اچھی طرح۔''

وہ گیا تو نہیں مگر اس نے رخ پھیر لیا۔ بڑا ہی ڈھیٹ تھا۔ سکون غارت کر دیا تھا اس نے۔

''ہرایرے غیرے کو منہ لگاتے ہو نا،'' بیوی غرائی''بہ خدا میں ہوتی تو......''

''تم ہوتیں تو کیا کر لیتیں؟'' مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں تمہیں اچھی طرح! کسی مسئلے میں شیئر کرنے کی بجائے سارا ملبہ مجھ پر ڈال دیتی ہو۔''

''کسی نے کہا تھا گدھوں والی حرکتیں کرو؟'' وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔

''دیکھو! حد سے نہ بڑھو، حد میں رہو۔'' میں چلایا''چلو نکلو یہاں سے۔''

''ہاں آں۔'' اس نے لمبی''ہاں'' میں سب کچھ کہہ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی میں حد کے سرے پر آ گیا ہوں۔

''چائے پیو گے؟'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے میری کمزوری مجھے یاد دلا دی۔

''لے آؤ۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ چائے لینے کے بہانے چلی گئی۔ اپنی انا بچالے گئی مگر چائے نہ لائی، حتیٰ کہ میرے ہاتھ پاؤں سردی سے سن ہوگئے۔ انگلیاں برف تھیں۔ میں نے جلدی سے ہیٹر آن کر دیا۔ چند لمحوں میں ہاتھ پاؤں، انگلیاں ، گھٹنے، ٹخنے پگھل سے گئے۔ مجھے گرمی لگنے لگی۔

اب کیا کیا جائے؟

میں نے روشن دان کھولنے کی کوشش کی۔ ہیٹر، گیس کا تھا اور روشن دان کھول دینا ہی مناسب تھا، بلکہ ضروری تھا مگر وہ کھل نہیں رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد بھی وہ نہ کھلا۔ شاید برسوں بند رہنے کی وجہ سے اس میں زنگ لگ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زوردار ٹھوکروں سے کھل جائے گا، مگر مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ اترتی نیند کا نشہ سرور بن کر خون میں پھیل رہا تھا اور اس وقت ہر قسم کی ٹھوکر لگانے کی سکت کو چاٹ رہا تھا۔

''نہ سہی۔'' میں نے سوچا۔ ''میں ہیٹر بند کر دیتا ہوں۔''

میں نے ہیٹر بند کر دیا۔ ٹمپریچر نارمل ہونے لگا مگر گیس سے کمرہ بھر گیا تھا۔ یقیناً ہیٹر میں کچھ خرابی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا۔

میں نے دروازہ کھول دیا مگر اس کے ساتھ حرارت بھی نکل گئی۔ کمرہ پھر ٹھنڈا ہوگیا، پھر بھی میں نے سونے کی کوشش کی اور سو گیا، گہری نیند!

ایک زوردار دستک نے مجھے جگا دیا۔ سورج کی کرن بند روشن دان سے اندر آ رہی تھی۔

دستک دوبارہ ہوئی مگر یہ اس طرح دستک نہ تھی، دبی دبی سی! کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔

''کون ہے؟'' میں نے کھڑکی کھول کو پوچھا۔

''ہم ہیں جی!'' آواز آئی۔ میں نے باہر جھانکا۔ کچھ لوگ دروازے پر جمع تھے۔ وہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ وہ کون تھے۔ جانے کون تھے! صبح ہی صبح کسی کے دروازے کو یوں پیٹتے ہیں بھلا! مجھے برا لگ رہا تھا۔

''حاجی افضل معلوم ہوتا ہے۔'' بیوی نے چائے بناتے ہوئے دور سے بتایا۔

''محلے دار ہیں۔'' وہ بولی ''دس بارہ سال سے پڑوسی ہیں اپنے۔''

''واقعی؟'' مجھے ندامت ہونے لگی۔

''ہاں ہاں۔'' اس نے یقینی انداز میں کہا۔ میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔

''زحمت کے لیے معافی چاہتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا'' دراصل مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے۔''

''اندر تشریف لے آیئے۔'' مجھے اپیکیٹس بہت عزیز ہیں۔

''جی نہیں۔ بس کھڑے کھڑے!'' رک کر اس نے بات بڑھائی۔ ''وہ درویش تھا نا اپنا......''

''کون درویش؟''

''وہ جی، وہ پروفیسر تھا پہلے۔'' دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

''وہ پاگل؟ وہ پروفیسر تھا؟'' میں نے ہکلا کر پوچھا۔

''او جی اب تو بس ایسے ہی تھا۔'' تیسرا بھی بول پڑا۔

''وہ رات مر گیا جی سردی سے۔'' اس آدمی نے نجات بھرا سانس بھر کر کہا۔ ''کفن دفن کے لئے......''

''جی ہاں......تجہیز و تکفین......'' دوسرا اتنا ہی کہہ پایا۔

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ میں واقعی سمجھ گیا تھا۔ ''آپ کو پیسے چاہئیں نا؟ کتنے؟''

''جو توفیق ہو، دے دیجیے۔''

''کتنے کی ضرورت ہے؟''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر لیڈر جیسا آدمی بولا'' کچھ رقم جمع ہو چکی ہے۔''

''کم کتنے ہیں؟'' میں نے بات کاٹ دی۔ میں ابھی اور سونا چاہتا تھا، ہاں کچھ دیر اور!

''کم؟'' وہ سوچنے لگا'' کم...... لگ بھگ ڈیڑھ سو۔''

میں اندر لپکا۔

بیوی دروازے کے پیچھے سے سب کچھ سن چکی تھی، بولی'' کچھ زیادہ ہی دے دیجیے۔ حیثیت کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیے۔''

میں نے جیب سے روپے نکالے تو اس نے اپنا پلو بھی کھول دیا۔ ''سو کا نوٹ ہے، میری طرف سے۔''

میں نے دیکھا، وہ بے حد سنجیدہ تھی اور دکھی بھی!

''کوشش کیجیے۔'' وہ بولی'' کہ لاش زیادہ دیر تک سڑتی نہ رہے۔'' اور رک کر اس نے کہا'' یہ کمبل بھی! سنا ہے میت کو بھی سردی لگتی ہے۔''

''ہاں!'' میں نے تائید کی۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔''

محلے داروں سے میں نے کہا'' کوشش کیجیے، لاش زیادہ دیر تک سڑتی نہ رہے، ثواب کا کام ہے۔'' میں

نے روپے ان کی جھولی میں ڈال دیے۔ واپس آ کر میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند اڑ چکی تھی۔ وہ آدمی ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔

''اچھا ہوا مر گیا، بے چارہ۔'' بیوی بولی۔ ''روز سردی میں ٹھٹھرتا تھا۔''

''ہاں!'' میں نے اطمینان کا سانس لے کر جواب دیا۔ ''کم از کم دستک تو نہ دے گا نا اب!''

''اور کیا۔ روز دروازہ پیٹتا تھا۔'' یہ بڑبڑاہٹ میری بیوی کی تھی۔

☆☆☆

# شکست کے رتھ پر سوار

زندگی بھرپور رواں دواں تھی۔ سورج بھرپور چمک رہا تھا۔ پودوں کی باڑھ جو اس وسیع سڑک کے کنارے شاید اس کا حسن بڑھانے کے لئے لگائی گئی تھی اور اب دھول، مٹی اور مکڑی کے جالوں میں اٹی ہوئی تھی، وہ اس باڑھ کے قریب کھڑی اپنی مطلوبہ بس کی منتظر تھی۔ اس کے پاس محض ڈھائی گھنٹے تھے۔ بچوں کے اسکول سے گھر لوٹنے سے قبل اسے بازار سے خریداری کے کچھ کام نمٹا لینے تھے۔

ایک آدھ رکشہ قریب سے گزرا مگر وہ اس کے اشارہ دینے پر بھی نہ رکا۔ کوفت کے عالم میں اس نے ٹریفک کانسٹیبل کو دیکھتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا کہ کب اسکا ہاتھ بلند ہو اور سامنے اس پار کھڑی اسکی مطلوبہ بس چند گز کا فاصلہ طے کر کے اس کے پاس پہنچ جائے۔ ''کتنا کہا تھا فوزان سے آج گاڑی گھر پر چھوڑ جائیں۔ مگر نہ جی۔'' کوئی خاتون قریب سے گاڑی ڈرائیو کرتی گزری تو میاں سے شکوہ ذہن میں ابھر آیا۔

''آج تو سورج جیسے آگ برسا رہا ہے۔'' اس فقرے پر اس نے گردن ترچھی کر کے آواز کے رخ پر دیکھا، وہ لڑکی ہاتھوں میں دستانے اور چہرے پر اسکارف کا چھجہ بنائے کسی سے موبائل پر مصروف گفتگو تھی۔ حمنہ کے ہونٹ ذرا سے مسکراہٹ کے عالم میں پھیلے اور وہ سامنے کھڑی اپنی بس کی طرف بڑھ گئی۔ سورج پھول کب برساتا ہے؟ حرکت میں آتی بس میں نشست سنبھال کر اس نے ایک اختیاری نگاہ باہر ڈالتے ہوئے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے سوچا جو بدستور فون پر مصروف تھی۔

''کس قدر خود غرضی ہے، سانس لینے کو جگہ نہیں ہے اور کنڈیکٹر کا بس نہیں چل رہا کہ ہر راہ چلتے کو بس میں سوار کر لے۔'' حمنہ نے بس میں بڑھتے رش کو دیکھا تو جل کر ساتھ بیٹھی خاتون سے کہا جو محض مسکرا کر رہ گئیں۔

''لگتا ہے آپ کو عادت نہیں ہے، ہمارے لیے تو یہ معمول کی بات ہے۔'' کچھ توقف کے بعد انہوں نے چھالیہ کھڑکی سے باہر تھوکتے ہوئے کہا۔

حمنہ کا دل چاہا پوچھے''رش یا تھو کنا؟'' لیکن اس سے چپکی کھڑی عورت کے پاس سے جس قسم کی ناخوشگوار بو اٹھ رہی تھی، اس میں اس کو سانس لینا بھی محال لگ رہا تھا۔

اپنے آپ کو سکیڑتے ہوئے اس نے ذرا پہلو بدلا تو بالکل پاس کھڑی ایک اور محترمہ کے قمیض کے دراز چاک سے جھانکتے کمر کے خوبصورت خم پر نگاہ ٹھٹک گئی۔اس نے قمیض کے دراز چاک کھینچ کر اس 'حسینہ' کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا کہ نہ جانے کس کس کے 'حواس' اس نظارے سے'' متاثر'' ہو رہے ہونگے۔ شکر ہے یہ بیٹھ گئی، حمنہ نے اس کو بیٹھا دیکھ کر سکون کی سانس لی، 'حسینہ' اب سر سے ڈھلکتے دوپٹہ کو صحیح کر رہی تھی۔ ''ہائے' ظالم ! کچھ قبا کا بھی دھیان کیا ہوتا۔'' حمنہ نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ آدھی آستین سے نکلتے دھوپ سے سنولائے بازو اور چہرہ اس کے ساتھ زندگی کا رویہ دکھا رہا تھا۔مگر بھلا ہو رواج کا کہ اس کی مار سے کسی کو امان نہیں۔حمنہ کا تجزیہ ابھی جاری رہتا لیکن مطلوبہ اسٹاپ آچکا تھا۔

بس سے اترتے ہی مخالف سمت پر لگے بل بورڈ پر حمنہ کی نگاہ جم گئی۔ تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ زیب تن کیے وہ جس قاتل انداز میں تھی وہ لان کا اشتہار نہیں بلکہ انسانی حسن کا اشتہار زیادہ تھا۔''اس کو یہاں تک نہیں آنا چاہیے تھا۔'' حمنہ کے دل میں بل بورڈ پر بنے اس چہرے کو دیکھ کر افسوس پھیلنے لگا۔ پچھلے برس تک تو یہ چہرہ اس کے پڑوس میں نظر آتا تھا، تب تک تو وہ من موہنا سا چہرہ جس کے گرد سنہری بالوں کے لچھے تھے اور چمکدار بھوری آنکھیں محض مارننگ شوز کی میزبانی تک محدود تھیں۔وہ اکثر حمنہ کو جب بھی ملتی تو یہ جملہ کہنا نہ بھولتی'' آنٹی انسان کا اپنا آپ اچھا ہونا چاہیے ہمیں کیا کسی سے لینا دینا۔'' حمنہ اس کے آنٹی کہنے پر جز بز تو ہوتی لیکن پھر سوچتی'' واقعی کتنے باوقار انداز میں پروگرام کرتی ہے۔ میری بیٹی سے بس چار پانچ سال ہی بڑی ہوگی لیکن کتنی میچور لگتی ہے یہ خیالات سے۔''

'آج سورج واقعی آگ برسا رہا ہے' اس نے بہ مشکل اپنی نگاہ ہٹائی اور بیگ سے ویٹ ٹشو نکال کر پسینہ سے نم ہوتے چہرے پر پھیرا۔ دھیمی سی خوشبو کے بجائے خوشبو کا دریا جیسے بہہ اٹھا، اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑا مسلا ہوا پیپر دیکھا جس میں وہی ہلکی سی مہک تھی، جو چند ہی لمحوں میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ یقیناً کوئی

معطر وجود قریب سے گزرا ہے،حمنہ نے سڑک پار کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر قدم رکھ دیا۔ اسی بل بورڈ کے نزدیک جہاں کومل عارف پینٹ کی گئی تھی۔ وہ لڑکی جسے حمنہ نے بڑا ہی شائستہ پایا تھا۔ گو اماں جان اور فوزان دونوں کو اس کے مارننگ شوز پر بھی اعتراض تھا مگر وہ سوچتی ان دونوں ماں بیٹوں کا وژن بہت ہی محدود ہے، ان کو عورت بس روایتی کاموں میں مصروف اچھی لگتی ہے۔ ''ہائے! انجینئرنگ یونیورسٹی کے وہ دو سال اگر چار سال ہو جاتے تو میں بھی آج کسی پوسٹ پر ہوتی۔'' اسے قلق ہونے لگتا کہ نہ پڑھائی کے دوران شادی ہوتی اور نہ وہ انجینئر بننے سے محروم رہتی۔

کومل عارف پر اس نے ایک بار پھر نگاہ ڈالی اور تیار ملبوسات کی دکان کی طرف قدم بڑھا دیئے جہاں شیشے کے پار دلکش لباس ٹنگے نظر آرہے تھے۔ ایک ڈمی کو لباس سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ پلاسٹک سے بنے اس نسوانی بدن کا بدن کھلا تھا۔ اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے والا چارہ گر نہ جانے کس دھیان میں تھا! شاید بے حسی میں، شاید برف زار میں یا شاید الاؤ میں۔ حمنہ سر جھٹک کر دروازہ دھکیلتی اندر داخل ہوگئی۔

''جی میڈم! کس موقع کے لیے آپ کو ڈریس چاہیے؟'' ایک نازک سی لڑکی سامنے آکر بولی۔ نیلی قمیض، سفید ٹراؤزر کے ساتھ سفید نیلی دھاریوں والا سکارف گلے میں ڈالے اس کامنی سی لڑکی کا لہجہ خالص کاروباری تھا۔ ''ہلکی پھلکی شام کی تقریبات کے لیے۔'' حمنہ نے فوری جواب دے کر دکان میں اے سی کی پھیلی ہوئی خوشگوار خنکی کو محسوس کیا، نرم نرم سی روشنی میں ٹھنڈا ماحول اور دکان میں نوجوان سٹاف جو مستعدی سے گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا ایک دراز قامت سیلز مین حمنہ کے ساتھ موجود لڑکی کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگا، تو وہ حمنہ کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ لیکن شاید نوکری کی مجبوری کے تحت جلد ہی واپس گاہک کی طرف دھیان لوٹ آیا۔ حمنہ نے پل بھر کے لیے دونوں کو دیکھا اور ایک سوٹ اپنی بیٹی کے لئے پسند کر کے اس لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رقم کی ادائیگی کے بعد جب وہ شاپر ہاتھ میں تھامے خارجی راستے کی جانب بڑھی تو ایک بار پھر وہی خوشبو اس سے ٹکرائی جس نے بس سے اتر کر بل بورڈ دیکھتے ہوئے اسے چونکا دیا تھا۔ ایک فربہی کی جانب مائل خاتون پروقار لباس میں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ مہاگنی رنگ میں رنگے بالوں میں جدید وضع کے سن گلاسز لگے تھے، بلاشبہ ان کی خوشبو

اپنے آپ میں گم کو بھی دستک دینے والی تھی۔حمنہ نے بے اختیار تھم کر انہیں دیکھا، ایک اسمارٹ سا سیلز مین بڑی خوشدلی سے ان کی طرف متوجہ تھا۔

''آہ! انسانوں کی زندگی بس اسی لیے رہ گئی ہے''راکھ ہی راکھ۔'' اس کی یاداشت میں اماں جان(ساس) کا فقرہ گونجا......اور بے وقت گونجا......

''بھلا اس خوبصورت ماحول میں راکھ کا کیا کام اماں جی۔'' اس نے تصور ہی میں اماں جی کو ناراضگی دکھائی کہ انہوں نے یہاں بھی اسے نہیں بخشا اور سارا سرور ایک چھنا کے سے ختم کر دیا۔

حمنہ نے ان صاحبہ کی دلکش مسکراہٹ سے بنتا نادیدہ دھواں اردگرد محسوس کیا اور قدم آگے بڑھا دیئے۔

دروازے کے باہر دو قدم کے بعد ہی دھوپ موجود تھی۔ اندر کی ٹھنڈک بھی بس اندر ہی رہ گئی تھی۔ اب دھوپ والے راستہ پر چل کر ہی مزید خریداری کرنا تھی۔ پہلے سورج کی شعاعوں میں اتنی چبھن نہیں ہوتی تھی۔ اوزون کی تہہ میں سوراخ ہوا، دنیا سے دوا کی تاثیر اور دعا کا اثر بھی غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے اپنے سرخ پڑتے ہاتھ کو دیکھا جہاں دھوپ کی تپش سے چھوٹے چھوٹے دانے سے ابھر آئے تھے، جن میں خارش ہوتی تھی۔ یہ مسئلہ سالوں پرانا تھا۔کتنی دوائیں اور کتنی دعائیں آزمالیں لیکن حمنہ کو لگتا تھا کہ اوزون کی حفاظتی تہہ کے چھید سے آنے والی الٹروائلٹ شعاعیں دوا اور دعا پر حاوی ہوگئی ہیں۔ ہر سال گرمیوں میں یہ تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ چاہے دستانے بھی پہن لیے جائیں۔کوئی افاقہ نہ ہوتا تھا۔

اس وقت بھی کوئی ایک ابر کا ٹکڑا اوپر آسمان پر نہ تھا۔حمنہ نے تکلیف کو نظرانداز کرتے ہوئے ہاتھ میں پہنی واحد طلائی چوڑی کو قمیض کی آستین سے نکلتے دیکھا تو دھک سے رہ گئی، گھر سے کام نمٹانے کے دھن میں اس کو اتارنا یاد ہی نہ رہا اور اب یہ شخص کیسے نگاہیں گاڑ رہا ہے۔اس نے دو قدم کے فاصلے پر موٹر سائیکل میں بیٹھے غنڈہ شکل کے آدمی کو اپنی طرف گھورتا پایا اور تیزی سے اسٹور میں داخل ہوگئی، آخری کام فیشن میگزین کی خریداری تھی۔اپنے طور پر خوب اطمینان کر لینے کے بعد جب وہ اسٹور سے باہر آئی تو بھی اس کا دل ڈر رہا تھا۔''زندگی ایک خوف بن کر رہ گئی ہے۔'' اس کا دل بھر آیا۔

یہ شخص ابھی تک اسی جگہ بیٹھا تھا۔ حمنہ نے

اضطراری انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے پاس سے گزرتے رکشہ کو اشارہ دیا اور تیزی سے اس میں بیٹھ گئی۔ رکشہ والے نے بھی فوراً ہی اسٹارٹ لیا تو اس کی جان کو کچھ اطمینان ہوا۔ گھر پہنچتے ہی منہ مانگا کرایہ ادا کرنے کے بعد بھی نہ جانے رکشہ میں کیا خرابی ہوگئی تھی جو وہ ڈرائیور وہاں سے جا ہی نہیں رہا تھا۔ اب تو حمنہ کی جان اور ہی ہوا ہونے لگی۔ اس نے انٹرکام کے بٹن پر جو انگلی رکھی تو ہٹائی ہی نہیں۔ گلی میں بھی اکا دکا ہی لوگ تھے۔ جیسے ہی شناخت کرانے کے بعد کل کی آواز پر لاک کھلا تو وہ سرعت سے گیٹ دھکیلتی اندر داخل ہوگئی۔

سامنے دروازے پر ہی اسکی سولہ سالہ بیٹی نشوا کھڑی تھی۔ سامان کے تھیلے اس کو تھماتے ہوئے وہ اندر داخل ہوگئی۔ صوفہ پر ڈھیتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ریموٹ اٹھا کر بٹن پریس کیے اور اسپلٹ آن کردیا۔

''آپ بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ باہر واقعی بہت گرمی ہے۔'' نشوا نے محبت سے کہتے ہوئے ماں کے ہاتھ میں پانی کا گلاس پکڑایا۔

''گرمی تو ہے ہی لیکن خدشات بہت ہیں۔ ہر وقت لگتا ہے حالت جنگ میں ہیں۔ چوڑی اتارنا بھول گئی تھی۔ بس خوف رہا کہ کچھ حادثہ نہ ہوجائے۔''

نشوا مزید کچھ پوچھے بنا ماں کے دانوں سے بھرے ہاتھ تھام کر ان پر آئس کیوب پھیرنے لگی۔ حمنہ نے محبت سے بیٹی کے معصوم چہرے کر دیکھا اور بے اختیار اسے ایک بار پھر کومل عارف یاد آ گئی۔

''کتنی تیزی سے وہ میچور لڑکی بدل گئی۔''

''کون؟'' نشوا نے ماں کے بے ساختہ جملے پر اپنا ہاتھ روک کر پوچھا۔

''کومل!''

''اماں! کس کو مشہور ہونا۔ پیسہ کمانا، سلیبرٹی بننا اچھا نہیں لگتا۔ آپ نے اس کو لان کے اشتہار میں نہیں دیکھا، وہ اسکی برانڈ ایمبیسڈر رہے۔ وہ اپنا فلیٹ اور گاڑی خرید چکی ہے، لوگ جو ایک عمر میں جا کر حاصل کرتے ہیں، وہ اسے کتنے جلدی لے لیا۔''

بیٹی کی بات سن کر حمنہ کو اپنے اندر سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس نے بے اختیار سیدھا بیٹھتے ہوئے نشوا کو دیکھا۔ ''کیا تم اس کو آئیڈیلائز کرنے لگی ہو؟''

نشوا نے ماں کے لہجے میں چبھن محسوس کر لی تھی۔

''پتہ نہیں اماں میں اس کو کیا کرتی ہوں لیکن بندہ

اس طرح اتنی چھوٹی عمر میں اتنا کچھ کمالے تو...... میں تو بالکل Spell bound ہوگئی ہوں۔'' آخری جملہ اس نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے ماں کا موڈ خوشگوار کرنا چاہا۔''ویسے کچھ عرصہ پہلے تک تو آپ کو بھی کومل عارف بہت پسند تھی بلکہ شاید اسکول بل بورڈ پر ٹنگا دیکھنے سے پہلے تک۔'' بیٹی نے کافی حد تک درست تجزیہ کیا تھا مگر حمنہ خاموش رہی۔

''راجکماری! یہ آ کاش یہ پربت یہ سب تمہارے گیت گاتے ہیں۔'' نشوا نے اچانک کھڑے ہوکر رقص کے سے انداز میں نصف دائرے میں گھوم کر ہاتھوں کو بھی ہلاتے ہوئے یہ جملہ کہا تو حمنہ ششدر رہ گئی۔

''کیسا؟'' اس نے ماں سے تعریفی جملہ سننا چاہا۔

''اگلے ہفتہ سکول فنکشن میں ہونے والے ڈرامہ میں ڈائیلاگ ہے۔'' اس نے ماں کی سوالیہ نظروں کا جواب دیا''میں اس میں راجکماری کی رازدان دوست بنی ہوں۔'' اس اطلاع پر حمنہ کی بھنویں تن گئیں۔

''یہ ڈرامہ ہے یا کلاسیکل ڈانس؟''

''اماں! آپ واقعی زبردست ہیں۔اس ڈرامہ میں کم سے کم آواز کا استعمال کرتے ہوئے جملوں کی ادائیگی حرکات کے ذریعے ادا کرنی ہے،جس کی ادائیگی جتنی طاقتور ہوگی وہ اتنا ہی اپنے کردار میں کامیاب رہے گا۔'' نشوا نے لفظ حرکات استعمال کیا رقص نہیں۔ شاید وہ اطلاع کو سنگین بنانے سے بچنا چاہ رہی تھی لیکن حمنہ کوئی بدھو ماں نہ تھی۔وہ سمجھ چکی تھی کہ اسکی بیٹی اگلے ہفتے اسکول اسٹیج پر آ کر رقص کے لیے تیار کردی گئی ہے۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارا ایسا کردار ادا کرنا کس قدر غیر مناسب ہے، کیسے کیسے لوگ ہونگے جو تمہیں اس طرح پرفارم کرتا دیکھیں گے۔'' حمنہ کی سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ بیٹی کو کس طور سمجھائے۔''کچھ اپنے گھر کی عزت کا بھی خیال کرو نشوا۔ میں نے کبھی تمہیں کسی مثبت سرگرمی میں حصہ لینے سے نہیں روکا لیکن رقص بہرحال تم کو زیب نہیں دیتا۔'' حمنہ بیٹی کی آنکھوں میں اپنی اس ''نئی مہم'' کے لئے واضح جوش دیکھ رہی تھی۔

''اماں! میرا کردار محض کچھ منٹ کا ہے، کپڑے بھی قابل اعتراض نہیں ہیں، جس وقت میں ہونگی اسٹیج پر کتنے سائے لہرا رہے ہوں گے۔ واضح تو میں ایک آدھ منٹ ہی نظر آؤں گی۔اب اس میں غیر مناسب کی کیا بات ہے؟''

اب کہ نشوا کی آواز میں چڑنے کا سادھیما تاثر تھا۔ بچوں خصوصاً نشوا کی عمر کے بچوں کے فیصلوں پر

محض حکم کے ذریعہ قدغن لگانا اس گھر کا رواج نہ تھا۔ دل کی خواہش منہ زور گھوڑے کی طرح بن جاتی ہے اگر اس پر سواری کرنے والا ایک چابک برسانا شروع کردے۔ چابک کی ضرب ہوسکتا ہے کچھ وقت کے لئے سرکشی کو روک دے لیکن موقع ملتے ہی اختیار کا ایسا مظاہرہ کیا جاتا ہے جس میں کوئی لچک نہیں رہتی۔ اماں جی کے فلسفے نے حمنہ کو بچوں کے ساتھ خاصی حدتک ''فرینڈلی ماسٹر'' بنا رکھا تھا، پر یہ نشوا؟ اسے کیا ہوگیا؟ حمنہ کا سر دکھنے لگا۔

کانوں میں ہیڈفون لگائے تیز متحرک انگلیوں کے ساتھ فوزان رات بستر میں ٹانگیں پھیلائے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھے، حمنہ دھپ سے برابر میں آ کر بیٹھی تو لمحہ بھر کو میاں نے نظریں اٹھائیں۔ شاید بیوی کچھ کہہ رہی تھی، اس لیے ہلتے لب دیکھ کر ہیڈفون کانوں سے ہٹا لیے۔

''لیڈی گاگا سے فرصت مل جائے تو مجھے بھی سن لیجیے، کاش اماں جان کے فلسفے نے کچھ اس معاملے میں بھی کام دکھا دیا ہوتا۔'' حمنہ نے فوزان پر چوٹ کی تو وہ محض مسکرا کر رہ گئے۔

''حاضر ہوں میں مدد کو جان و دل سے۔ شوہر ہوں میں آپ کا کارآمد سا۔'' لمحے بھر بعد وہ بیوی کی طرف متوجہ ہوکر بولے تو بھی حمنہ کے چہرے پر خوشگوار تاثر نہ آسکا۔

''نشوا نے اسکول فنکشن میں کلاسیکل ڈانس میں حصہ لیا ہے۔'' حمنہ نے بنا تمہید باندھے پریشانی آگے رکھ دی۔ بس اس ایک جملے کو بتا کر وہ اسطرح ہلکی ہوئی تھی جیسے اب سارا معاملہ فوزان کے ہاتھ میں ہے، وہ جادو کی چھڑی سے نشوا کے غلط رخ کو صحیح کر دیں گا۔

فوزان نے نہایت غور سے بیوی کو دیکھا جس کے چہرے پر کچھ دیر پیشتر موجود اضطراب غائب ہو چکا تھا وراب وہ میاں کی جانب سے کسی ایسے گُر کی منتظر تھی جو اس تازہ بہ تازہ پریشانی کو حل کردے۔ فوزان کی پیشانی پر اچانک بل پڑ گئے۔

''نشوا کے اس سارے عمل کی ذمہ داری ان پر بھی ہے جنھوں نے اس لیے راہیں ہموار کیں ورنہ میری بیٹی تو قطعاً ایسی نہیں۔'' فوزان کا لہجہ سخت، آواز دھیمی اور نگاہیں کاٹ دار ہوچکی تھیں۔ ''حمنہ! محض دو سال پرانی بات آپ اتنی جلدی کیسے بھول گئیں جب ہم نے نشوا کا داخلہ اس ادارے میں کرایا تھا بلکہ یہ صرف اورصرف آپ کا فیصلہ تھا۔ میں نے ہر طرح سے یہ

سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس اسکول کی انتظامیہ کے تہذیب واخلاق کے معیارات ہمارے حساب سے یکسر مختلف ہیں، اس وقت آپ کا ارشاد تھا کہ عمدہ تعلیم اور ایکسپوژر نشوا کو یہیں مل سکتا ہے، اللہ جانے کونسا ایکسپوژر آپ کے تصورات میں منڈلا رہا تھا، اور کونسی تعلیم آپ نے عمدہ جانی تھی۔''

فوزان جب ناراضگی یا خفگی کے عالم میں ہوتے تو حمنہ سے الفت اور یگانیت کا تاثر ختم کرنے کے لئے ''آپ، جناب'' پر اتر آتے تھے۔ اب بھی کہہ وہ آپ رہے تھے مگر اس میں کوڑے کی سی مار لپٹی تھی۔ ایسے میں حمنہ جان جاتی تھی کہ اس وقت کچھ کہنا شعلوں کو ہوا دینے کے مترادف ہے، اور اس وقت تو فوزان کے آئینہ دکھانے کے باوجود وہ دل میں تلملا رہی تھی کہ کیوں یہ بے وقت کی راگنی میاں صاحب نے چھیڑی ہے، بھلا اس میں ادارے میں داخلے کی بات کہاں سے آ گئی۔ کیا سارے طلباء رقص کے اسٹیج تک آ جاتے ہیں جو نشوا وہاں تک چلی گئی۔ فوزان نے نہایت تاسف سے حمنہ کو دیکھا جیسے اس کی سوچ کا سارا متن اس کے چہرے پر ابھر آیا ہو۔

''خاتون! کسی نظام میں رہتے ہوئے انسان اسکے خلاف نہیں چل سکتا۔ اسکے سارے تصورات، خیالات، رجحانات سب اس کے زیر اثر آ جاتے ہیں۔ یہ دین سے باغی......''

''آپ کونسے ایسے نظام میں ہیں جو موسیقی کے بغیر حساب کتاب نہیں دیکھا جا سکتا۔ دین تو اس کی اجازت بھی نہیں دیتا۔'' حمنہ اب تپ اٹھی تھی۔ دل چاہا کہہ دے واعظ صاحب آپ کا ہی موڈیفائیڈ ورژن ہے آپ کی اولاد۔ باپ کو موسیقی کا شوق ہے تو بیٹی کو رقص کا، مگر دل میں آنے والے خیالات دل ہی میں اس نے رکھے، زبان پر لانے کی فضول جسارت اس نے نہ کی۔ غصہ کی حالت میں انسان بڑا بے انصاف ہو جاتا ہے۔ باپ کو موسیقی کا شوق بے شک تھا لیکن کبھی کبھار ہی یہ پورا کیا جاتا وہ بھی اپنے کمرے میں ہیڈفون چڑھا کر تا کہ دوسروں کے لیے یہ کشش نہ بن سکے، اور نشوا نے بھی اس سے پہلے کبھی رقص کی کلاکار بننے میں دلچسپی نہ لی تھی۔

فوزان اپنی اس خامی سے آگاہ تھے لیکن برسوں قبل ہر ہفتہ تیمور سے ہونے والی ملاقات اس شوق کو ختم نہ ہونے دیتی تھی۔ پھر وقت کے ساتھ ملاقاتیں گھٹ گئیں لیکن شوق بڑھ گیا۔

بہت اچھا سکول کا ساتھی تھا۔ایم سی ایس کیا اور کسی تعلیمی ادارے ہی میں ریسرچ کے شعبہ میں تعینات بھی ہوگیا۔زندگی میں تیمور نے شاید ہی سوچا ہو کہ وہ سرسنگیت کو پیچیدہ عددی نظام اوراس ہنر پرفوقیت دے گا جواس کے دماغ سے نکل کر جب کمپیوٹراسکرین پرمنتقل ہوتا تو لوگ کہتے''یہ ہوا کیسے؟''اور وہ لوگوں کی تعریفی نظروں کے جواب میں بڑی عاجزی سے کہتا''پتہ نہیں خودبخودہوتا چلا گیا۔''

وہ بلاشبہ کمپیوٹر سائنس کا اعلیٰ ترین فن کار تھا۔گائیگی کے لئے اسکی آواز ہمیشہ سے ہی بہترین تھی لیکن اس کا امتیاز اس کی اعلیٰ ترین دماغی صلاحتیں تھیں،پھر یوں ہوا کہ ایک ایک کرکے اس کے اردگرد موجود سراہنے والوں نے اپنی اپنی جگہ پرزندگی کی دوڑ میں سرپٹ بھاگتے ہوئے اسکو کہیں بہت پیچھے چھوڑ دیا ۔زمانے میں برپا تیزی سے ہونے والی تبدیلیوں کے بہاؤ پر وہ چل پڑے،سارے فلسفے ہدایات،احکامات کہیں کھو گئے،اور تیمور بس ان کو دیکھتا رہ گیا۔ایسے میں کسی نے اسکو احساس دلایا کہ تمہارا سرمایہ تو تمہاری آواز ہے، اس کا جادو جگاؤ اوراپنے لیے جوت جلاؤ۔کب تک کٹیا کے درویش بنے رہو گے۔مٹی کے پیالے پراکتفا کرتے رہے تو کبھی بھی لوگ پلٹ کر تم کو نہ دیکھیں گے۔

''لوگ تو پلٹ کر اب بھی نہیں دیکھتے۔انکو مل بھی جائے تو ہاتھ نہیں ملاتے'' تیمور نے سرگوشی میں کہنا چاہا مگر چپ رہا۔ اپنی قیمت اپنے آپ کون نیچے دکھاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہی تھی۔انجینئر تیمور کہیں کھو گیا تھا،ایک فوزان تھا جواس سے آنکھ بھی ملاتا اور ہاتھ بھی۔ اس کے لئے رکتا بھی اوراس کے ساتھ چلتا بھی۔لیکن گلوکار تیمور کے بننے میں اسکی مزاحمت تیمور کی نفسیات کو متاثر نہ کرسکی اور جب ایک مشہور جریدے نے اس کا انٹرویو لیتے ہوئے یہ سوال کیا''آپ کی قیمتی ترین متاع؟'' تو وہ بلا جھجک بولا''گبسن لے پال گٹار۔''

عطر والے کی صحبت انسان کو عاطر نہ بھی بنائے تو خوشبو ضرور اس کے ساتھ کردیتی ہے۔ فوزان بھی موسیقی کی جانب بڑھنے سے نہ رک سکا۔ جب کبھی اماں جی کی نظریں فوزان کے ہیڈفون لگے کانوں پر اتفاقاً پڑجاتیں تو وہ بیٹے کو سرزنش کے ساتھ تیمور کے لئے بھی دعا کرنا نہ بھولتیں۔انہوں نے فوزان اورفوزیہ کے بن باپ کے کس طرح پالا تھا اور کیسے ان پر اپنی

توانائیاں بہائی تھیں۔اس کا گواہ ان کا رواں رواں تھا۔

شادی کی رات جب گھونگھٹ الٹتے ہی ان کے میاں نے ان پر یہ واضح کردیا تھا کہ وہ حسن کے اس معیار پر پورانہیں اترتیں جوان کومطلوب ہے،تو کیسے انکواپنے اردگرد شعلے بلند ہونے لگے تھے۔کتنی امیدیں ،خواہشات جن کی کونپلیں ہی پھوٹی تھیں، سنگدل جملوں کی کاٹ کہاں سہہ سکتی تھیں بھلا،وہ معصوم فطرت تو یہ بھی نہ سوچ سکی کہ کہنے والابھی نہایت عام سا انسان ہے۔وجاہت کی کوئی رمق اس کے حصے میں بھی نہ آئی تھی۔حسن اس پر بھی مہربان نہ تھا،روشنی اس کے وجود پر بھی نہ چھائی تھی۔بس جیسا وہ تھا ویسی ہی وہ تھی بلکہ شاید بہتر کہ نرم دلی نے اسے ملاحت کا روپ عطا کردیا تھا۔فکرونظر کی بالیدگی نے قلبی اطمینان کے اثرات ڈال رکھے تھے۔وہ تو ایک ایسا جاں فزا جھرنا تھا جس میں کثیر بھلائی تھی لیکن وہ اس کے اتنے قریب جا کربھی ان تمام بھلائیوں کے فوائد سے محروم رہا،اسکے اخلاق کی بوسیدہ جڑیں زندگی کواول دن سے ہی گھٹن بنا چکی تھیں۔وہ جس طرح پلا بڑھا تھا،جن اداروں میں مختلف علوم جس طرز پر پڑھ چکا تھا، اور جس طرز پر معاشی میدان میں اپنی مہارت دکھا رہا تھا۔اس سے وہی ذہنیت بن سکتی تھی جواس کی تھی۔

زندگی شاید بہتر ہوجاتی ،اگر وہ ذہنی گمراہی اور اخلاقی گراوٹوں میں اس کا ساتھ دے دیتی۔لیکن ایسی کوئی رخصت اس نے حاصل نہ کرنا چاہی اورمحض چار سال بعدوہ فوزان اورفوزیہ کوطلاق کے ساتھ لے کرنکلی تو وہ فوزیہ کی دوسری سالگرہ کا دن تھا۔

والدین کے گھر پہنچنے کے بعداس نے بڑے بے تاثر لہجے میں فقط یہ کہا''جونقصان ہوچکا ہے اسے نقصان مان لیجیے آپ لوگ، چار گھنٹہ کی شادی کی تقریبات کے بعد چار سال میں ہر تعلق کا خاتمہ آج ہوگیا۔''

اس کی کیفیت میں کہیں بھی ٹوٹ پھوٹ کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے، جبکہ ماں باپ کے لیے یہ خبرکسی سانحہ سے کم نہ تھی۔

''اپنا گھر بسانے کے لئے دانش مند عورت ''سب کچھ'' کرگزرتی ہے۔'' ماں نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر اس کے اطمینان پر تعجب کا اظہار کیا۔''ذاتی معیار کوپس پشت ڈال کر اپنی نسل کے لئے فیصلہ کرتی ہے،تم کیسی ماں ہوجس نے اپنے گھرکو بچانے کے لئے

ہوش سے کام نہیں لیا۔‘‘

باپ کا چہرہ ماں کے لفظ لفظ کی تائید کرر ہا تھا۔ چار برس قبل تیسری بیٹی کی شادی کے بعد وہ جس اطمینان سے بقیہ زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے۔ اس میں محض چار سال بعد ہی دراڑ پڑ چکی تھی۔ دراڑ بھی کیا پورا اطمینان ہی زمیں بوس ہو چلا تھا اور ایک وہ تھی، ایسے سکون میں دکھائی دیتی تھی جیسے تازہ ہوا میں سانس لینا اب نصیب ہوا ہو! کسی نے اس کو گزشتہ چار سالوں میں اتنا سلجھا نہ پایا تھا جتنا وہ اب تھی ایسے جیسے اپنے معلق حال اور مستقبل کا معاملہ نمٹا لیا ہو۔

والدین اور دونوں بھائیوں نے یہ کیفیت دیکھ کر اسکو مزید کسی امتحان میں نہ ڈالا اور نہ اس نے ان میں سے کسی کو آزمائش سے دوچار کیا۔ سلائی کٹائی کی مہارت نے اسے مقامی مارکیٹ میں موجود درزیوں کی موجودگی میں عمدہ خاتون درزن بنا دیا۔ گھر والوں کے لئے یہ قدم پسندیدہ نہ تھا لیکن انہوں نے مزاحمت نہ کی۔ اسکی اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری سے بچت اسی صورت میں ممکن تھی جب وہ اپنے مسائل کو ان کے مسائل نہ بناتی ہاں بے شک یہ ضرور تھا کہ اس کے اپنے رشتوں نے اسے جذباتی تنہائی سے دوچار نہ کیا، شاید وہ اسے مادی وسائل بھی فراہم کر دیتے مگر ان میں سے کسی کے پاس بھی افراط نہ تھی۔

زندگی اس طرح گزارنا کوئی سہل نہ تھا۔ بچوں کے لئے باپ کی کمی پوری کرنا ناممکن تھا۔ لیکن ایک سڑی گلی ذہنیت کے ساتھ اسکے بچوں میں کوئی بھی صلاحیت نہیں پنپ سکتی تھی۔ سب سے بڑی علیحدگی کا تمام تر فیصلہ یکطرفہ تھا۔ اس نے بہرحال یہ نہ چاہا تھا۔ فوزان اور فوزیہ کی ماں، ماضی کی امینہ سے حمنہ کی اماں جان بننے تک زندگی صرف ایک رات کا ناخوشگوار خواب نہ تھی جو اب آنکھ کھلتے ہی ختم ہوگیا۔ کتنے ہی مرحلے ایسے آئے جب بے اختیار اسکو اپنی ماں کا یہ جملہ یاد آتا۔ ’’عورت تو سب کچھ کر گزرتی ہے اپنا گھر بچانے کے لئے۔‘‘ اور وہ سوچتی کہ کیا اسے بھی اس شام اپنے شوہر کے مہمانوں کو خوش کر دینا چاہیے تھا۔ اپنے گھر کو بچانے کیلئے؟ کیا گھر کو بچانے کے لئے ہر قیمت ادا کر دینی چاہیے؟ چاہے وہ کچھ بھی ہو؟‘‘

اس نے اپنے گھر میں کبھی یہ نہ بتایا تھا کہ وہ اپنے میاں کی نظروں میں اتنی معمولی ہستی ہے جسے صرف ہیجان انگیز لباس اور ادائیں ہی اسکی زندگی میں شامل رکھ سکتی ہیں۔

''تم ایسی کوئی مارلن منرو نہیں جو نقاب بھی پہنے تو جگمگائے۔ عام سی ہو جسے نمایاں ہونے کے لئے یہ غیرضروری چیزیں ہٹانا ہوں گی۔'' وہ اکثر اسکے لباس پر طنز کرتا۔ کاٹ داراور چھیدنے والی آواز اسکی رگ رگ میں پھیل جاتی۔

''ٹچ می ناٹ کا پودا کوئی بھی ڈرائنگ روم کی زینت نہیں بنانا تو پھر تم کیوں اس ڈرائنگ روم میں موجود ہو...... اس گھر میں موجود ہو...... بلکہ میری زندگی میں موجود ہو؟ ذرا سا کوئی ہاتھ ملالے تم سے تو ایسے کپکپانے لگتی ہو جیسے مر ہی جاؤ گی۔ جاؤ ابھی نکل جاؤ میری زندگی سے۔''

اور پھر وہ اس سہ حرفی لفظ کی تین مرتبہ گردان سن کر باہر آ گئی۔ اسکے سجائے گھر سے جہاں کچھ ہی دیر میں دوستوں کی پارٹی شروع ہونے والی تھی۔ رنگ و بو کا میلا لگنا تھا، اور وہ وہاں سے بے دخل کر دی گئی۔

اس شام کے بعد زندگی کے اس نے ایسے ایسے رنگ، لہجے اور روپ دیکھے جو شاید ہی اس نے کہیں پڑھے یا سنے ہوں لیکن وقت گزرتا ہی گیا اور وقت گزر ہی جاتا ہے کچھ خام تھی اگر وہ، تو کندن بن گئی، بچوں کی تربیت میں بڑی جان گھلائی، برائیوں بھرے معاشرے میں رہتے ہوئے انسانوں کو نیک اٹھان پر پالنا بڑا ہی صبر آزما اور مشقت بھرا کام ہے۔ وہ بھی تھک جاتی تھی معاش کی چکی چلانا بھلا کوئی کھیل تھا! ہڈیاں تڑخنے لگتی تھیں۔ بچوں کی جذباتی اور نفسیاتی ضرورتیں اپنی جگہ بدستور برقرار رہتیں تو وہ سوچتی۔

''کاش حضرت عمرؓ کا سا نظام ہوتا اور زندگی کچھ تو آسان ہوتی، کاش کوئی تو ایسا نظام ہو جو میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے تریاق مہیا کر سکے۔''

آنسو ٹپک کر کام کرتے، ہاتھوں پر پھیل جاتے لیکن حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی۔ ہر طرف نفسا نفسی اور خرابی۔ ہر جانب سے انسانوں کی قوتوں کے غیر اخلاقی راستوں کی فراہمی۔ وہ ایک راستہ پر ناکہ لگاتی تو بچے دوسرے کی طرف لپکتے۔ اسکول جاتے فوزان کو سگریٹ کی لت سے روکا تو فوزیہ کو خوشبو لگا کر گھر سے باہر نہ جانے کی منطق سمجھانا مشکل ہو گیا۔ محلے کی دکان پر موجود وڈیو گیمز گھنٹوں کھیلنے کے نقصانات ذہن میں بٹھائے تو نمازوں کی جانب سے فوزان کی بے توجہی سامنے آنے لگی۔ فوزیہ کا اصرار کرکٹ اسٹیڈیم جانے کا بڑھنے لگا تاکہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہاں براہ راست کرکٹ کے

ستاروں کو دیکھ سکے۔''زندگی ہے یا طوفان' وہ سوچتی'خرابیاں طوفان کی طرح امڈی چلی آرہی ہیں۔ میں جس گھناؤنے طرزِ زندگی سے راضی نہ تھی، میرے بچے کہیں اس پر راضی نہ ہوجائیں۔'

اسے جھرجھری آجاتی اور دعاؤں میں رقت شدید ہوجاتی۔ یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ جب تک دنیا کی باگ ڈور اخلاقی اور دینی تنزل میں مبتلا لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی اس وقت تک تباہی کے گڑھے کی جانب لوگ سرپٹ جاتے رہیں گے۔ خواہ مخواہ طلاقیں بھی ہوں گی، گھر بھی اجڑیں گے، ہلاکتیں بھی ہوں گی، بے حیائی اور بدکرداری بھی ہوگی، جھوٹ بھی تصنیف ہوگا اور ظلم اور ناانصافی بھی۔ اس کے کپڑا کاٹتے ہاتھ تھم جاتے اور نگاہیں کہیں افق پر جم جاتیں۔

''یااللہ! تو گواہ رہنا میں نے ہر قیمت پر اپنا گھر نہیں بچایا۔ یا ارحم الراحمین! میری اس کوشش کو قبول کرتے ہوئے میرے بچوں اور ان کی نسلوں کو اپنی حفاظت میں لے لینا۔''

لوگ کہتے تھے یہ صوفی ٹائپ درزن ہے۔ بڑا گلا نہیں بنائے گی، بغیر آستین قمیض نہیں بنائے گی...... ٹخنوں سے اونچی پینٹ نہیں سیے گی تو کھائے گی کیا...... واللہ خیرالرازقین۔ اس کی ضرورت کا رزق اسے ملتا رہا۔ بازار میں موجود عمارت کی منزل پر موجود کسی بوتیک کے گودام کا کچھ حصہ اسے بطورِ مکان ملنا بھی اس کا رزق تھا۔ محنتی کاریگر لڑکیاں ملنا بھی نعمت اور پھر مقدر کا لکھا رزق ملنا نہ رکا۔

اتنی محنت اور پیہم کوششوں کے ساتھ اللہ کی مدد بھی شامل ہوئی۔ اس کے بچوں میں دین سے لگاؤ بھی پنپا اور عمدہ ہنر بھی دونوں بچوں میں منتقل ہوتا گیا۔ فوزان اور فوزیہ دونوں ڈیزائننگ کے کورس کے ساتھ ماں کی صلاحیت سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کے دل ودماغ میں ''وہائٹ کالر جابز'' کا کوئی خبط سوار نہ ہونے دیا تھا۔ بائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک فوزان بی کام کرنے کے ساتھ ایک سلائی کٹائی کا ماہر بھی بن چکا تھا۔ فوزیہ کی کٹنگ میں ابھی وہ مہارت نہیں آئی تھی جو فوزان کا خاصہ تھی۔ قینچی چلاتے وہ اب بھی رکتی تھی جبکہ فوزان میں یہ جھجک نہ تھی، شاید یہاں بھی جنس کا فرق کام کرتا ہے۔ مرد تیزی سے بنا ٹھٹکے آگے بڑھتا ہے، عورت رکتی ہے، دیکھتی ہے اور پھر آگے بڑھتی ہے۔

تیمور سے فوزان کی دوستی سے اس کو کبھی شکایت نہ

رہی۔ نہ اس وقت جب وہ دونوں اسکول میں پڑھتے تھے اور نہ تب جب وہ اپنے بچوں کے لئے زندگی کے کچھ عیش مہیا کرنے کے قابل بنا دی گئی۔

جس دن اس نے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ جدید طرز پر بنائی گئی اپنی نئی دکان میں قدم رکھا اسی دن تیمور نے مقامی ٹی وی چینل کے لئے گانا ریکارڈ کرایا۔ کسی مشہور ڈرامہ سیریل کے آغاز کے لیے بیک گراؤنڈ سے ابھرتی تیمور کی آواز میں غزل نے لوگوں پر سحر طاری کر دیا۔ اس کی آواز دل و دماغ کو جیسے اپنے قبضے میں کر لیتی تھی۔ فوزان بھی اس کے پرستاروں میں شامل ہو گیا۔ کام کے دوران اکثر و بیشتر دھیمی آواز میں موسیقی کی لہریں پھیلنے لگیں۔ اس نے کئی مرتبہ بیٹے کو سرزنش کی، اس کے نقصانات دہرائے۔

''فوزان! نبی کریمؐ کا فرمان ہے میں آلات موسیقی ختم کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں اور تم ان چیزوں سے محبت کر رہے ہو۔ کیا معلوم کیسے برے اثرات ہماری زندگی میں اسکی وجہ سے ہوں۔ مجھے لگتا ہے یہ جو فوزیہ کا پیر ہر وقت سن ہو جاتا ہے یہ سب تمہارے اس فضول شوق کے اثرات ہیں۔''

ماں کی بات سن کر فوزان نے بے اختیار قہقہہ لگایا، وہ مختلف ڈریس ڈیزائنرز کے کیٹلاگ دیکھتے ہوئے ان کو سکین کر کے کمپیوٹر میں فولڈرز بنا رہا تھا۔ اس وقت بھی کوئی انگریزی گیت ہلکورے لے رہا تھا۔

''امی جی! یہ فوزیہ کا پسندیدہ گانا ہے وہی آن کر کے گئی ہے سچنگ سیکشن کی طرف۔ میں تو زیادہ تر تیمور کو ہی سنتا ہوں ویسے پاؤں واؤں اس کا ٹھیک ہے ابھی تو، لیکن آپ کو نہیں پسند تو میں بند کر دیتا ہوں۔''

اس نے دکان میں داخل ہوتی خواتین پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور سسٹم چھوڑ کر اپنی مخصوص میز پر آ گیا۔

''ارے! آپ وہی ہیں نا جنہوں نے تیمور جہاں کے ساتھ ''حسن کے نظارے'' گایا تھا۔''

آنے والی لڑکی نے فوزان پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی پر جوش لہجے میں کہا تو ماں پر بے ساختہ نظر ڈالتا ہوا فوزان بوکھلا گیا۔ وہ پوری طرح اسی رخ پر متوجہ تھیں۔ گاہکوں کو انتظار کی زحمت سے بچانے کیلئے بیک وقت دو جگہ آڈرز وصول کیے جاتے تھے۔ اپنا کام چھوڑ کر وہ بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''نن......نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں

......میں تو محض ڈریس ڈیزائنر ہوں، سنگر کہاں۔''

وہ لمحہ بھر بعد سنبھل کر بولا تو بھی اس لڑکی کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ جب تک وہ دکان میں موجود رہی گاہے بگاہے بغور فوزان کے چہرے پر کھوجتی ہوئی نگاہیں ڈالتی۔

''آپ کی آنکھوں اور بالوں کا رنگ بے شک وہ نہیں ہے، اور نہ ہئیر اسٹائل لیکن آپ پھر بھی وہی ہیں۔'' جاتے جاتے اس نے میز پر جھک کر سرگوشی کی تو وہ ایک بار پھر نروس ہوگیا۔ اسکو جواب دیئے بغیر اس نے بمشکل ایک مسکراہٹ ہونٹوں پر جمائی اور کسی کام کی طرف متوجہ ہوگیا۔

شام ہمیشہ ہی بہت مصروف ہوتی تھی۔ ماں اور بہن گھر چلے جاتے تھے۔ اور وہ اکیلا ہی تمام معاملات سنبھالتا تھا۔ اس نے موقع ملتے ہی تیمور کو فون کر دیا ''ابے تجھے میں نے کہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ نہ گھسیٹ، پر کہاں سننا تھا تو نے۔ مروا دیا نا آج، پہچان لیا دکان میں آئی لڑکی نے مجھے۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لینز لگانے کا، تیزی وجہ سے مجھے اپنے خوبصورت بالوں سے بھی محروم ہونا پڑا۔'' بے اختیار فوزان کا ہاتھ اپنے شیو کیے ہوئے سر پر چلا گیا۔ ''اور مونچھیں بھی اڑا دیں پھر بھی وہ ظالم پہچان گئی۔''

نان اسٹاپ بولتے ہوئے اس نے یہ غور ہی نہیں کیا کہ اگلے طرف بالکل خاموشی ہے۔ جب سارا غبار نکل گیا اور اسے احساس ہوا تو وہ چونک گیا ''اب بولتا کیوں نہیں؟''

''جی تیمور صاحب اپنا سیل فون یونیورسٹی کی لیب میں چھوڑ گئے ہیں۔'' کسی نسوانی آواز نے اسے بڑی شائستگی سے بتایا تو اسکی کوفت مزید بڑھ گئی۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے فون منقطع کر دیا۔

''گیا ہوگا بابر سے ملنے، لائن بدل لی لیکن مشینوں سے محبت نہیں گئی۔'' اس نے تیمور کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں موجودگی کی وجہ سوچی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ماں کی متوقع تفتیش کے بارے میں اندازہ لگانے لگا۔ لیکن پھر جلد ہی اس کی ذہنی رواس نسوانی آواز کی جانب منتقل ہوگئی جو کچھ دیر پیشتر تیمور کے فون سے ابھر رہی تھی، کتنی خوبصورت ہنسی تھی اس کی، فوزان کو اب بے اختیار دھیان آیا کہ وہ اس کی تمام بات سننے کے بعد لمحہ بھر کو ہنس پڑی تھی اور پھر اس نے بات بتانے کے بعد فوراً ہی فون بند کر دیا تھا۔ اس نے بے اختیار ایک بار پھر تیمور کے سیل پر نمبر ملا دیا۔

''ہلو بابر اسپیکنگ ......فوزان صاحب فون اب بھی میرے پاس ہے، آپ کا فون کچھ دیر قبل بھی آیا تھا، کوئی ضروری کا ہوتو میرے پاس تیمور کا لینڈ لائن نمبر بھی ہے آپ وہاں کرلیں۔'' بابر اور فوزان کی رسمی سی جان پہچان تھی، وہ شاید اور بھی کچھ کہتا لیکن فوزان نے جس آواز کو سننے کے لئے فون کیا تھا وہ نہ جانے کس کی تھی۔ مایوس سا ہوکر اس نے فون بند کردیا لیکن وہ ہنسی اسکی یاداشت میں محفوظ ہوگئی۔

حیرت انگیز طور پر ماں کے سوالات کے لئے وہ جواپنے آپ کو تیار کررہا تھا۔ وہ انہوں نے پوچھے ہی نہیں حالانکہ وہ ان کے تاثرات سے اسی وقت بھانپ چکا تھا کہ انہیں اس گاہک لڑکی کی بات پر یقین ہے، شاید وہ آج کل فوزیہ کے لئے آئے رشتہ میں ذہنی طور پر اتنی مصروف تھیں کہ کوئی اورنئی بات شروع نہ کرنا چاہ رہی تھیں۔

اچھا خوشحال گھر کا بیٹا تھا، تعلیم بھی مناسب تھی، طور طریقے بھی مہذب تھے لیکن جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ دوستوں کی فہرست میں ایسی لڑکیاں بھی شامل ہیں جن کے کردار کا ڈھنڈورا شہر بھر میں ہے تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

''امینہ کہاں تک اپنی چھلنی باریک کروگی، لڑکا، گھر ، پیسہ سب کچھ ٹھیک تو ہے بس کبھی کبھار ہی تو ایسا شغل میلہ ہوتا ہے۔ اور آج کل کون اتنا پارسا ہے جب کہ بنی سنوری لڑکیاں ہر طرف موجود ہوں، اچھے بھلے بھی طوفان میں تنکے کی طرح بہہ اٹھتے ہیں۔''

اس کے بھائیوں نے اس کو ہمدردانہ مشورہ دیا۔

''کیسی بات کررہے ہوں توفیق! کیا ہم اپنی بچی کو بھاڑ میں جھونک دیں۔''

اس کے بوڑھے باپ نے اپنی نحیف آواز میں یہ جملہ کہہ کر اس کی برسوں سے جمع شدہ تھکن کو جیسے دھوڑ الا تھا۔ یہ جملہ گویا اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ بھی بیس برس قبل بھاڑ میں بھن رہی تھی۔

''ابا جان! اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم ان باتوں پر رشتے چھوڑتے رہیں، خوشحال گھروں میں یہ سب عام باتیں ہیں۔'' چھوٹا باپ کا فلسفہ برداشت نہ کرسکا۔

امینہ کو لگا اس کا حلق خشک ہو چلا ہے۔

''اگر امینہ کو نہیں پسند تو میں اپنی لڑکی سے کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' وہ پوری طرح راضی تھا۔

اس رشتہ سے انکار پر فوزیہ کی آنکھوں میں چمک بھی کچھ ماندسی ہوگئی۔ ماں نے محسوس کرنے کے باوجود

یہ موضوع نہ چھیڑا، فوزیہ محض ایک گھریلو لڑکی بے شک نہ تھی لیکن ماں اور بھائی کے ساتھ کام میں محفوظ طریقے سے شریک تھی۔ مردوں سے اس کا رابطہ کسی اشد ضرورت کے تحت ہی ہوتا تھا، اس میں فطری شرم و حیا اور جھجک مفقود نہ تھی سو وہ موجودہ رشتہ کو پسند کرنے کے باوجود ماں سے کچھ نہ کہہ سکی اور اس کے ماموں نے بہ خوشی اپنی بیٹی کی نسبت اس خاندان میں طے کر دی جسے امینہ نے ناپسند کر دیا تھا۔ جب تک دھوم دھام سے ماموں کی بیٹی کی بارات نہیں آئی اس وقت تک فوزیہ کا کوئی اور رشتہ بھی نہ آیا۔ بارات ہی کے ساتھ آئی کسی مہمان خاتون نے اسے محتاط لباس اور لڑکوں کے ساتھ محتاط رویہ پر ولیمہ میں مرکز نگاہ رکھا اور پھر اپنے بیٹے کا رشتہ دے دیا۔ یہ رشتہ گزشتہ رشتہ کی طرح کسی خوشحال گھرانہ کا نہ تھا۔ کوئی بھی پہلو پچھلے رشتہ سے بڑھ کر نہ تھا۔ ہاں مگر لڑکے کے کردار کی سب نے بلا جھجک بہت تعریف کی۔ ماں نے محسوس کر لیا تھا کہ فوزیہ کو اس مرتبہ کوئی خاص دلچسپی اس خاندان میں محسوس نہیں ہو رہی، وہ ماموں کی بیٹی کو ایک آرام دہ زندگی گزارتا دیکھ کر اپنے لئے ویسا ہی چاہتی ہے، خود وہ بھی اپنی بیٹی کے لئے اچھی زندگی ہی چاہتی تھیں لیکن اس کے لئے ''ہر قیمت'' دینا انہیں گوارہ نہ تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ باکردار زوج سے بڑھ کر دنیا میں کی نعمتیں نہیں۔ صاف ستھرے اعتماد بھرے میاں بیوی کے رشتے کے سکون کے آگے مال کے ڈھیر خوشی نہیں دے سکتے۔ عمارت کھوکھلی ہو تو رہنے والے ہمیشہ خطرات میں گھرے رہتے ہیں۔ اندیشہ، بدگمانیاں، غلط فہمیاں ہر آن ابھرتی ہیں جو ہر لطف غارت کر دیتی ہیں۔

فوزان بھی ماں کی سوچ سے متفق تھا، گو اپنے گھر آئی تازہ فراوانیِ نعمت کے دور میں فوزیہ کا رشتہ اپنے سے کم مرتبہ پر کرنے کی کسک اس کے دل میں بھی تھی لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بننا چاہتا تھا۔ اب تک آئے چار رشتوں میں سے یہ ہر لحاظ سے مثبت پوائنٹس زیادہ رکھتا تھا۔ سوائے دھن دولت کے، وہ بھی مل جاتا اگر قسمت کا دھنی ہوتا۔

مگر فوزیہ کے دل کو یہ سب کچھ نہ بھایا اور اس نے ماں کے پوچھنے پر صاف انکار کر دیا۔ ''امی جی! میں خواہشات کے لئے ترسنا نہیں چاہتی۔ پینتیس ہزار کمانے والا اپنی بارات بھی مانگے تانگے کی گاڑی میں لائے گا اور وہ گاڑی بھی ایک چھوٹے سے گھر میں رکے

گی اوراس گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں میری زندگی کے کتنے ہی قیمتی ماہ وسال گزر جائیں گے لیکن میں عروبہ کے کندھے سے کندھا ملا کر کبھی نہ کھڑا ہو سکوں گی۔'' اس نے خواہشوں سے بوجھل جملے کہے تو ماں اور بھائی نظریں جھکا کر رہ گئے۔

بے شک یہ حقیقت تھی، ایسا ہی ہونا تھا، امکانات یہ ہی کہتے تھے لیکن اللہ پر امید اور یقین اس کے خلاف جذبہ دیتا ہے، وہ انسانوں میں آنے والے کل کے لیے روشن سوچ کا تصور دیتا ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی کا یقین دلاتا ہے۔ صحیح راستہ کے چناؤ اور پھر اس پر ڈٹے رہنے پر دل میں سکینت اتارتا ہے۔

یہ سب تصورات اپنی جگہ پر درست لیکن ان سب کو ابھارنے والے عوامل کی ماحول مستقل بیخ کنی کرتا نظر آرہا تھا۔ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' جیسے خیالات کی ہر طرف سے بھرمار میں فوزیہ کا ایسا سوچنا عجیب نہ تھا۔ اس کی نظر میں اس کے لیے آئے گئے اچھے بھلے رشتے سے انکار کر کے ماموں زاد عروبہ کو تھما دیا گیا تھا۔

''امی! اگر آپ میری مرضی کے حساب سے فیصلہ کرینگی تو مجھے یہ رشتہ منظور نہیں اور اگر آپ محض اپنی اور فوزان کی رائے پر اعتماد کرتی ہیں تو جو آپ کہیں گی مجھے منظور ہے۔'' بیٹی کی رائے جان کر امینہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

''تمہارے ہاتھ میں اتنا زبردست ہنر ہے کہ تم اچھا خاصا خود بھی کما سکتی ہو۔'' فوزان جو بالکل خاموشی سے ماں اور بہن کی گفتگو سن رہا تھا بولا تو وہ بے اختیار کھڑی ہوگئی۔ اسکے انداز میں اضطراب ظاہر ہورہا تھا۔

''فوزان ایک سیٹ اپ قائم کرنے کے لئے بھی سرمایہ درکار ہوتا ہے، جگہ، کاریگر، مشینیں...... اور پھر سب سے بڑی بات دوسروں کی اجازت...... مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں کے ہاں خواتین کا کام کرنا اچھا سمجھا جاتا ہے۔''

اس کی بات سن کو فوزان نے ابرو اچکائے ''تو پھر انہوں نے رشتہ ایسی جگہ کیوں بھیجا ہے؟''

''رشتہ ہماری موجودہ حیثیت کے حساب سے دیا گیا ہے۔ پانچ برس پہلے تک بھی پلٹ کر دیکھو تو ایسے رشتے ہمارے خواہشمند نہیں ہوتے۔''

ماں کی بات دنیا کی حقیقت ظاہر کر رہی تھی۔ اب جب کہ شہر کے مشہور پوش علاقہ میں ان کی اپنی دکان تھی۔ جس کا سیٹ اپ جدید طرز پر کیا گیا تھا۔ جس

کے کام کرنے والے ماں بیٹا اور بیٹی باشعور پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے خاندانی پس منظر سے نکلے تھے اور جو اپنے کام کے لئے اپنے گاہکوں میں مقبول و معروف تھے۔ ایسے میں وہ محض درزی یا درزن نہیں رہ گئے تھے بلکہ آرٹسٹ کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ امینہ نے اول دن سے ہی اپنا لیبل ''آرٹسٹ'' کے نام سے بنوایا تھا جواب اپنی ایک مضبوط جگہ بنا چکا تھا۔ ان سے تعلق جوڑنے میں بہت سے لوگوں کو جو قباحتیں تھیں وہ اب ختم ہوگئی تھیں۔

''ویسے تو تیمور کی خالہ نے بھی اپنی دلچسپی فوزیہ میں ظاہر کی تھی، لیکن راتوں رات جیسے ان کے حالات تبدیل ہوئے ہیں مجھے کھٹک سی ہوئی ہے۔'' ماں کی بات سن کر جہاں فوزان چونکا وہاں فوزیہ کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اس کی نگاہوں میں وہ باوقار سی خاتون آگئیں جن کے دائیں ہاتھ میں پہنی گئی انگوٹھی کے ڈیزائن پر اس کی نگاہ ہمیشہ ہی رکتی تھی۔ ہرے رنگ کے اس پتھر میں عجیب سی ٹھنڈی چمک تھی۔ اور زندگی بھی ان کے لئے ٹھنڈی ہی لگتی تھی۔ بے فکری اور اطمینان جیسے ان کے وجود میں گھلا تھا۔

''راتوں رات آئے پیسہ کی بدگمانیاں تو کہیں سے بھی ان میں ظاہر نہ تھیں۔ امی تو غیر ضروری محتاط ہو چکی تھیں۔'' اس کے خیالات کا عکس آنکھوں میں آ رہا تھا۔

''چکن فیڈ کے لئے پاکستان کے نامور امپورٹر ہیں یہ لوگ۔ سنا ہے خاصی مشہور ایجنسی ہے ممنوع اجزا سے بنی فیڈ امپورٹ کرنے کے حوالے سے۔'' فوزان نے بظاہر سرسری لہجہ میں یہ اطلاع دی تو فوزیہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''یہ پانچواں رشتہ ہے جسے محض شبہہ پر مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ ٹھیک سے معلومات کرو پھر بات کریں گے۔'' امینہ کی آواز میں تھکان شامل ہوئی تھی۔ لگتا تھا لوگ رزق حلال کے تصور سے نا آشنا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ زمانے کی امامت فاسقوں کے ہاتھ میں ہو تو پھر کیسا حلال اور کیسا حرام...... انہوں نے بے اختیار سوچا اور فوزیہ کے کندھے پر تھپکی دیتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

فوزان بھی ماں کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گیا اور پھر دونوں ہی رشتوں کو بڑے حوصلے کے ساتھ کچھ ہی دنوں بعد انکار کر دیا گیا۔ ''یاارحم الرحمین! مجھے اپنی مخلوق کے سامنے ہلکانہ پڑنے دینا۔'' امینہ کے نفل کچھ بڑھ گئے اور دعاؤں میں تڑپ بھی۔

(جاری ہے)

☆☆☆

رفعت اشتیاق

# میری لائبریری سے

یہ کالم رفعت اشتیاق صاحبہ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل ارسال کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس تحریر کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنادے۔

| | | |
|---|---|---|
| کتاب کا نام | : | اسے زندہ کر دوبارہ |
| مصنفہ | : | قانتہ رابعہ |
| ناشر | : | عمار وحید سلیمانی |
| قیمت | : | 120 روپے |

جس طرح دریا اپنا راستہ خود بناتا ہے بالکل اسی طرح قانتہ رابعہ کا قلم، میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ بڑی ہی خوبصورتی سے دل کی بات کہہ دیتی ہیں۔ مختصر پیرائے میں لیکن عام لکھاری کے اندازِ تحریر سے ہٹ کر۔ پڑھنا شروع کردو تو پڑھتے ہی جاؤ۔ بے شک ایک مصنف حساس ہی ہوا کرتا ہے لیکن قانتہ رابعہ کی تحریر پڑھنے والے جانتے ہوں گے کہ حساسیت کے جس درجے پر وہ فائز ہیں۔ بہرحال میں تو یہ مقام کسی اور کو نہیں دے سکتی۔ یقیناً یہ کتاب جس کا نام ''اسے زندہ کر دوبارہ'' کوئی افسانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کرنے والی یہ تحریریں مختصر کالموں کا مجموعہ ہے جو خطیب کے قاری کی نظر سے ضرور گزری ہوں گی۔

کالم کیا ہیں بلاشبہ قرآنی حکمت کا نچوڑ ہیں۔ بس حالاتِ حاضرہ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر وہ حدیث یاد آ گئی۔ رسول ﷺ اللہ نے فرمایا مومن کی فراست سے بچو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، یقیناً یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے لہٰذا خود بھی پڑھیں اور بچوں کو بھی پڑھائیں۔ دوست، احباب کو گفٹ دیں۔ میں نے سوچا ''دیکھا ہے جو کچھ میں نے اور کو بھی دکھلا دے'' پرنٹنگ کی چھوٹی موٹی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھئے صفحہ 9 پر ''امت مسلمہ کا پاکیزہ سپوت'' عامر عبدالرحمٰن چیمہ شہید کے بارے میں تحریر۔

''قربان جاؤں میں امتِ مسلمہ کے اس پاکیزہ سپوت پر جس نے یہ ثابت کر دیا کہ امت مسلمہ بانجھ نہیں۔''

آتشِ نمرود میں اقبال کے الہامی کلام کو پڑھنے کا دعویٰ ہر کوئی کرسکتا ہے لیکن اسے سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ان کے اشعار کو سمجھنے کے لئے وہی کیفیت درکار ہوتی ہے جو نزول کے وقت ان کو ہوتی ہوگی۔ ان کے اشعار بارگاہِ الٰہی سے ملے انمول خزانے ہیں جن کی

روح تک پہنچنے کے لئے شوق لگن اور Achievement کے اسی جذبے کی ضرورت ہے جو دنیا کے اہم کام سرانجام دینے کیلئے چاہئیں۔ جب کبھی وہ حاصل ہوجائے تو ان کا کلام دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے پھر اشعار کے لفظ، لفظ نہیں رہتے۔ جھلمل جھلمل کرتے وہ آبگینے بن جاتے ہیں جن کو شانِ کریمی کہا جاسکتا ہے۔

''مغلوب کون'' میں اپنے بچپن میں جب بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے اس کے متعلق لکھتی ہیں تو رونگٹے کھڑے کردیتی ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

''اذان سے گھنٹہ پہلے مجھے سوتے میں جیسے کسی نے کروٹ بدلوائی ہو...... بڑے پیار سے اور آرام سے۔ میں یوں اٹھی جیسے روئیں روئیں میں سکون کا احساس ہو...... بڑے پیار، محبت اور نرمی سے کسی نے حاضری کا شرف بخش دیا۔ ریاکاری سے ڈر لگتا ہے لیکن اسکے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہ مجھے تہجد کے لئے اٹھنے میں الارم کی مدد نہیں لینی پڑتی۔ بس اتنا ذہن نشین کر لیجیے کہ مغلوب کون ہے۔''

''اللہ کا قرب'' میں حج کا فلسفہ بہت ہی احسن طریق پر بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''یہ درحقیقت موت کا سفر ہے...... اپنے وجود کے اندر چھپے غارِ حرا میں چالیس دن اپنے آپ کو اپنی حقیقت کو کھوجنے کا عمل ہے۔ آپ سب جو ہزاروں دعووں کے باوجود مکروہ (فانی) دنیا کے جھمیلوں میں پھنس جاتے ہیں ان سے نکل کر اپنے گمشدہ عہد کی یاد ہانی کا موقع ہے۔ احرام، کفن کی یاد ہانی ہی نہیں کرواتا بلکہ آئندہ بچ جانے والی زندگی میں کپڑوں کی ڈیزائنگ کے پیچھے ہلکان ہونے سے منع کرتا ہے۔ طواف پتھروں کی عمارت کے گرد پھیرے لگانا نہیں بلکہ تمام ''حیاتی'' غیر اللہ کا ہر تصور دل سے کھرچ کے اللہ کا ہونا...... جس جنون اور جذبے سے ممکن ہے...... یہ صرف ابراہیمؑ کو ودیعت ہوا۔''

''جاگ مسلمان جاگ'' میں امت مسلمہ کا صحیح درد رکھنے والی یہ مصنفہ یوں گویا ہوئیں:

''میں جب ان ملعون یہودیوں کے اپنی دینداری مشکوک کرنے کے سیاہ کارنامے پڑھتی ہوں تو حیرت سے گنگ ہوجاتی ہوں۔ ان کی ہزاروں سالہ منصوبہ بندی کی ایک شق یہ ہے کہ ان مسلمانوں کے دل سے نبی اکرم ﷺ کی محبت کھرچ کھرچ کر نکال دو۔ یہ محبت کیسے نکالی جائے...... تحقیق یہ ہوئی کہ ان کو سنتوں سے محروم کردیا جائے۔ جتنا سنت پر عمل سے دور ہوں گے محبت سے محروم ہوں گے۔''

آخر میں لکھتی ہیں۔

''آپ احادیث پڑھتے جائیے اور اپنی بربادی کے اسباب ڈھونڈتے جائیے (مفہوم) اخیر امت میں یہود کی پیروی کا ڈر ہے...... یہودی گوہ کے بل میں جائیں گے تو مسلمان بھی پیچھے گھسیں گے...... اناللہ...... جاگ مسلمان جاگ۔''

''شکر بھرا دل کیسے ملتا ہے'' میں لکھتی ہیں۔

''تعلق جڑ جائے تو دعا کو بارگاہ الٰہی میں پہنچنے کے لئے راستہ نہیں بنانا پڑتا۔''

''اسے زندہ کر دوبارہ'' پڑھ کر آپ میری بات سے یقیناً اتفاق کریں گی کہ ہر کالم کا عنوان مختلف ہے لیکن شروع سے آخر تک تعلق باللہ کی کسوٹی پر پورا اتر کر تعلق باللہ ہی کے ذریعے خوشخبریاں کشید کرنے کی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

آپ کے اور کتاب کے درمیان زیادہ دیر حائل رہنا پسند نہیں کرتی لیکن کچھ باتیں شیئر کرنا ضروری سمجھتی ہوں جیسے ''رب کا قرب'' لکھتی ہیں۔

''جس طرح ایک دھڑ میں دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح ایک دل رحمان اور شیطان کے لئے نہیں دھڑک سکتا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم فتنوں کے جس دور میں پید اہوئے ہیں شیطان اور رحمان دونوں کے راستے پر چلتے ہیں اور اپنے آپ کو شاباش دیتے ہیں کہ رب اور دنیا دونوں کو راضی رکھ رہے ہیں۔''

''آج کے فرعون'' میں لکھتی ہیں۔

''اب قرآن صرف اپنے ارد گرد فرعون ڈھونڈنے کا نہیں کہتا بلکہ اسکے طریقہ واردات سے بھی آگاہ کرتا ہے تاکہ شناخت میں آسانی ہو......دکھ اس بات کا نہیں کہ آج فرعونیت کیوں ہے دکھ اس بات کا ہے فرعون سے سب راضی ہیں، موسیٰؑ کی للکار اور جذبہ ہر شہر کے ایک مولوی میں آجاتا تو جامعہ حفصہ پر یہ قیامت نہ بیتتی۔''

حج کے بارے میں چار کالم ہیں جو مصنفہ کے حج بیت اللہ کے شوق، جذبے اور ولولے کو اجاگر کرتے ہیں۔ صفحہ 34 پر لکھتی ہیں۔

''کیا آپ جانتے ہیں یہ کیفیت کیسے ملتی ہے؟؟ جب آپ میدانِ عرفات میں ایسی اذیت اور تکلیف سے دوچار ہوں جو دردِ زہ کا شکار عورت کی ہوتی ہے...... ہر گناہ اس وقت آپ کو یاد آئے تو وہی تکلیف، اذیت، رونا بلکنا...... ہاتھ جوڑنا...... جب تک گناہ کی ندامت یہ احساس پیدا نہ کرے رحمت کی بارش کیسے ہوسکتی ہے؟ پاک تو پانی سے ہوا جاتا ہے......ندامت اور خوف کا

ایک آنسو آپ کو گناہوں سے پاک کرسکتا ہے۔"

آگے لکھتی ہیں۔

"حج کا سفر بازیابی اور گمشدگی کا سفر ہے...... دنیا کے چند دن اسی بازیافت کے ہیں اور جب آپ حج کے ہر مناسک کی روح کو پالیں گے تو پھر اس معراج کو پہنچیں گے کہ احرام اتار کر بھی حالتِ احرام میں محسوس کریں گے...... گنتی کے چند دنوں کا یہ دنیا اور دنیا والوں سے فراق ہی جنت اور رب کا قرب بخش سکتا ہے۔ ہاں شاپنگ کی لسٹ، موبائل سے کم سے کم رابطہ رہے...... کہ یہی دنیا ہے اس دنیا کی آنکھوں کو یہیں چھوڑ جائیں کہ حج کے لئے تو "اور آنکھیں چاہئیں۔"

پھر "حج کا زمانہ آ گیا" میں لکھتی ہیں۔

"احرام ان سلا۔ بغیر جیب کے...... زیب وزینت، رنگ برنگی لیس اور کڑھائیوں کی شیدائی عورتو!...... سن لو احرام اور کفن بغیر میچنگ اور ڈیزائننگ کے ہوتے ہیں۔ عمرہ کے بعد ظاہری احرام اتار دیا...... لیکن تا دمِ آخر اپنے آپ کو حالتِ احرام میں محسوس کرنا" اس کی" نظروں میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ نیکیوں کی سرشاری کی بجائے گناہوں کے ٹوکرے اور ندامت کے انبار لے جاؤ۔"

قارئین! کتاب کیا ہے! لفظوں کے آبگینے۔ بار بار بھی پڑھیں تو دل سیر نہیں ہوتا۔ قانتہ رابعہ کے قلم کی اڑان "سفر حج اور حکومتی رکاوٹیں" تک لے آئی۔ یوں گویا ہیں۔

"کبھی کسی کو تڑپا کر بلاتا ہے اور کسی کو بلانے کے بعد تڑپاتا ہے...... یہ تڑپ ہی اس کے حضور قیمت رکھتی ہے۔"

"دل وہیں رہ گیا" صفحہ 108 "پاک دل تو زرخیز زمین کی مانند ہوتا ہے۔" موضوعات کی بھرمار میں ایک آخری موضوع "مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ" قرآن کے ذریعے انسان کو جوڑنے کا فن قانتہ رابعہ کے حصے میں آیا، بیشک میں ان دس بارہ سالوں کی، رویوں کی تبدیلی کی چشم دید گواہ ہوں۔ میرے محسوسات بھی یہی ہیں جو اس میں تحریر ہیں۔ بلاشبہ قانتہ رابعہ جہانیاں والوں کی جانب سے گوجرہ والوں کے لئے انمول تحفہ ہے، خزینہ ہے۔ لیکن بے علم نتواں خدا را شناخت بے علم تو خدا کی پہچان نہیں رکھتا بندہ کی کیا رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علم اور علم والوں کی صحیح پہچان عطا فرمائے آمین۔

☆☆☆

# میری لائبریری سے

نام کتاب : درس قرآن کیسے دیں
قیمت : 220روپے
ناشر : منشورات، منصورہ، لاہور
فون:35434909

درس قرآن مجید کے حلقے ہماری ایک معرف دینی روایت ہے جس سے اب شاید کوئی بھی بے خبر نہیں ہے۔ مردوں میں، خواتین میں، بچوں کے لیے، طالبات میں اور بعض جگہ خود مساجد میں ایسے حلقے مستقل قائم ہیں۔ ان دروس کے مستقل شرکاء یہاں بہت کچھ سیکھتے ہیں اور اپنی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ دروس قرآن اور ان کے شرکاء کی تعداد کو دیکھا جائے تو زندگی بدلنے اور دعوت قرآن کو اپنا مشن بنالینے والوں کی تعداد میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ اس معاملے میں بہت سے امور اور حالات کو اس صورت حال کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اہم ترین کردار اس فرد کا بھی ہے جس نے قرآن مجید کو پڑھ اور سمجھ کر یہ پیغام دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ خرم مراد صاحب کی اس کتاب ''دروس قرآن کیسے دیں'' کا مخاطب یہی لوگ ہیں۔

خرم مراد مرحوم کے درسِ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کمال کی تاثیر رکھی تھی۔ مجمع ان کی گرفت میں ہوتا اور قرآن مجید کے پڑھے ہوئے حصوں کے وہ معانی کھلتے جو پہلے ذہن میں نہیں آتے تھے۔ انہوں نے بہت وقت قرآن مجید پر غور وفکر میں گزارا تھا اور اس کتاب کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا ہنر پیدا کرنے میں بھی انہوں نے بڑی کاوش کی تھی جب وہ کچھ عرصہ لاہور میں قیام پذیر ہوئے تو تحریکی حلقوں کی ایک ہلچل ہم نے بھی محسوس کی تھی۔ قرآنی عربی کلاسوں اور درسِ قرآن ورک شاپ کی صورت میں۔ یہ پروگرام انہوں نے خواتین اور طالبات میں بھی کیے اور مردوں کے مختلف حلقوں میں بھی۔

انہیں میں سے ایک کی ''روداد'' کیسٹ سے تحریر کی زبان میں منتقل کر کے اس کتاب کی صورت میں

سامنے لائی گئی ہے۔ ہم نے اس کلاس کی ''تاثیر'' کا بھی مشاہدہ کیا تھا۔ کالج میں جب ہم درسِ قرآن رکھتے، تو ہماری وہ کلاس فیلو، جس نے پہلا درس کاغذ پر لکھا ہوا پڑھ کر دیا تھا، جب اس کلاس سے ہو کر آئی اور یونیورسٹی میں درس کا آغاز کیا تو ہم چونک گئے۔ پھر دوسرا اور تیسرا درس (کچھ اور شرکائے کلاس کے) اسی طرح کے سنے تو بڑی حسرت ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے، یہ کلاسیں محدود لوگوں کی ہی ہوسکتی تھیں۔ آج یہ کتاب ہاتھ آئی ہے تو وہ حسرت کچھ دور ہو رہی ہے۔

اس کتاب کے شروع کے دو حصوں میں ''فہم قرآن کے بنیادی اصول'' اور ''درس قرآن کی تیاری'' کے عنوانات کے تحت، صرف سولہ صفحات میں وہ طریقِ کار آ گیا ہے، جو درسِ قرآن دینے والے کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ باقی تقریباً ڈھائی سو صفحات کی یہ ساری کتاب منتخب آیات پر ''ماڈل درس'' اور شرکائے کلاس کے دروس کے جائزے اور تبصرے پر مشتمل ہے۔ ان جائزوں میں خرم صاحب نے بار بار دہرا کر پھر انہی اصولوں کا ذکر کیا ہے جو ابتدائی سولہ صفحات میں بیان ہوئے ہیں۔ یوں یہ ابتدائی صفحات اس کتاب کی جان ہیں۔ کسی بھی درسِ قرآن دینے والے کو، جو اللہ کے پیغام کو موثر انداز میں عام لوگوں تک پہنچانے کی خواہش رکھتا ہے، ان اصولوں کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے۔

یہ اصول بہت زیادہ نہیں ہیں۔ صرف چند نکات ہیں ''فہم قرآن'' بنیادی بات ہے۔ جتنی کوئی بات دل کے اندر گہری اتری ہوگی، اس کا مفہوم ذہن میں اچھی طرح راسخ ہوگیا ہوگا، اتنا ہی اس کو مختلف انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ آتا جائے گا۔ پہلی بات یہ لکھی ہے کہ بندہ اس اعتماد سے آغاز کرے کہ یہ کتاب (قرآن مجید) اس کے لیے نازل ہوئی ہے، وہ اسے سمجھ بھی سکتا ہے اور دوسروں تک پہنچا بھی سکتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس کے الفاظ (عربی سے واقفیت کم ہو تو ترجمہ) پر تدبر کیا جائے، گہرا غور وفکر، اور اس کے متن کے قریب تر رہا جائے۔ ہر بندہ اپنے حالات اور کیفیات کے مطابق دور کے معنی بھی سوچ سکتا ہے، لیکن زیادہ احتیاط کا اور اپنی گفتگو کو زیادہ موثر بنانے کا طریقہ بھی یہ ہے کہ متن سے خود بھی جڑے رہیں، دوسروں کو بھی اس سے جوڑیں کہ بہرحال یہ ''اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ ہیں۔'' (ص ۱۷)

دو باتیں یہاں اور بھی بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ

خود فہم وتدبر سے کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں اور دوسری یہ کہ اس متن پر خود سوالات قائم کریں۔ سوال علم کا فہم اور دروازہ ہے۔ سوال اٹھانے کا طریقہ خود قرآن مجید میں بار بار اختیار کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''درسِ قرآن کی تیاری'' کے بارے میں ہے۔ یہیں وہ رہنما اصول بیان کیے گئے ہیں جن کی روشنی میں خرم مراد صاحب نے کلاسوں کو تیاری کروائی اور انہی کے مطابق ان کا تجزیہ کیا۔

یہ چند مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ جو حصہ درسِ قرآن کے لیے منتخب کیا جائے اس کے مضامین پر بار بار غور وفکر کیا جائے۔ قرآن مجید بند کر کے بھی سوچا جائے کہ کیا مضامین تھے جو ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرے مرحلے میں ان مضامین کی ایک ترتیب قائم کی جائے اور تیسرے ان مضامین کے لحاظ سے متن کی تقسیم کر لی جائے۔ مثلاً دو آیات میں یہ مضمون آیا اور باقی تین میں یہ۔ خرم صاحب نے بجا رہنمائی کی ہے کہ تفہیم القرآن اور تدبر قرآن میں جو پیراگراف ترجمے کے قائم کیے گئے ہیں وہ بینادی طور پر مضامین کو الگ کرتے ہیں۔ البتہ یہاں (ص۲۲) پر انہوں نے واضح کیا ہے کہ یہ غور وفکر خود کریں۔ ترجموں سے ابتدائی طور پر مدد نہ لیں۔ اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ کم از کم ''مدرس'' تو بنیادی عربی کی واقفیت رکھتا ہو۔ چوتھا مرحلہ یہ ہے کہ الفاظ کے مفہوم پر گہرا غور وفکر کیا جائے۔ خرم صاحب کے الفاظ میں:

''ان الفاظ کو سمجھنے پر ہی قرآن مجید کا مفہوم اور پیغام پوری طرح سمجھنا ممکن ہوگا۔ بعض الفاظ بڑے معروف الفاظ ہوں گے، جیسا کہ رکوع اور سجدہ۔ ممکن ہے کہ آپ پہلی کوشش میں سمجھیں کہ رکوع کرنے کے معنی جیسا کہ ہماری زبان میں رکوع کرنا اور اسی طرح سجدہ کے معنی سجدہ کرنا۔ لیکن غور کرنے پر عمومی معنوں سے ہٹتے ہوئے کئی پہلو سامنے آسکتے ہیں۔''

رکوع اور سجدہ کے یہ ''اور معنی'' انہوں نے صفحہ۶۲ پر بیان کیے ہیں۔

اگلا معاملہ موضوع کا انتخاب ہے کہ سامعین اور وقت کی ضرورت کے مطابق ہو، مقرر سامعین کے ماحول اور علمی سطح کا اندازہ رکھے۔ (مثلاً سادہ گھریلو خواتین، پڑھی لکھی خواتین۔ اور دینی حلقوں سے وابستہ خواتین یہ تین مختلف طرح کی علمی سطح کے لوگ ہیں)

درسِ قرآن کے لیے وقت مقررہ کی پابندی وہ اہم معاملہ ہے جس پر پوری کتاب میں بہت زور دیا گیا ہے۔ وقت کے تحت ہی وہ موثر آغاز کو لائے ہیں اور اختتامی کلمات کو۔مختصراً یا وقت کی ضرورت کے مطابق تمہید ہو۔ درمیان میں اہم مضامین اور آخر میں مختصر خلاصہ۔ضروری ہے کہ گفتگو کو موضوع سے متعلق ہی رکھا جائے۔ آسان الفاظ استعمال کیے جائیں۔ ابتدائی کلمات اور اختتامی کلمات کو موثر بنانے کے لیے خاص کوشش کی جائے۔ اس طریقے سے ''قرآن مجید کے پیغام کو آپ موثر انداز میں اپنے سامعین تک پہنچا سکیں گے، نیز انہیں اس دعوت کو لے کر چلنے اور اس پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کر سکیں گے۔'' عمل پیرا ہونا اور دعوت کو لے کر ساتھ چل پڑنا۔ اگر یہ موثر درسِ قرآن کا ''اثر'' ہونا چاہیے تو ہم سب کو یہاں اپنے گہرے جائزے کی ضرورت ہے۔

آگے ان اصولوں کے مطابق درسِ قرآن دینے کا ''امتحان'' ہے اور خرم صاحب کا ان دروس کا جائزہ۔ یہ دراصل بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ انہوں نے بار بار ''شریک کلاس'' ساتھیوں کو توجہ دلائی اور ان کی اصلاح کی۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے درس کے جائزے میں جتنی غلطیاں نکلیں، آخری درس (پانچویں) تک ان میں بہت سی چیزوں کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ یہ بہتر رہا۔ خوب تر کی تلاش کا سفر تو کہیں رک نہیں سکتا۔ ان پانچ منتخب حصوں کے انہوں نے خود بھی ماڈل درس دیے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ (ایسے ہی ۱۴ ماڈل درس ''رب کا پیغام'' نامی کتاب میں بھی شائع ہو چکے ہیں صفحہ ۱۱)

کتاب کے آخر میں ایک بارہ دروسِ قرآن کا انتخاب شامل ہے، جو سال بھر میں ماہانہ درسِ قرآن کا نصاب بنایا جا سکتا ہے۔ دوسرا ۴۰ حصوں کا انتخاب۔ ان پر مفصل انہوں نے اپنی کتاب ''قرآن کا راستہ'' میں لکھا ہے۔ دروس قرآن کے تجزیے بہت معلومات افزا ہیں۔ ہم جیسے وہ لوگ، جو ان کلاسوں میں شریک نہیں ہو سکے، یہ کر سکتے ہیں کہ ان حصوں کا، اسی طریق کار کے مطابق، جو خرم صاحب نے بیان کیا ہے، اپنے طور پر درس تیار کریں اور ان رہنما نکات کی روشنی میں اپنا تجزیہ خود کریں۔

کتاب کو کیسٹ سے امجد عباسی صاحب نے تحریر کی صورت میں منتقل کیا ہے۔ ۱۱۰۰ کی تعداد میں چھپنے والی اس کتاب میں (آیات قرآنی میں زیادہ، اور اردو

عبارت میں قدرے کم) اغلاط اس کثرت سے ہیں کہ نشان دہی کرنا ممکن نہیں۔ خرم صاحب کی کتاب اگر چھاپی جائے تو کم ازکم اتنی توجہ دینے کی کوشش تو کی جائے جتنی مرحوم خود دیتے تھے۔ بقول مسلم سجاد صاحب ''نئی چیز بنا دیتے تھے۔'' خرم صاحب مرحوم کمپوزنگ یا املا کی غلطی پر سخت بے چین ہوتے تھے۔ ان کے زمانے کے ترجمان القرآن میں بھی املا کی غلطی دیکھنے کونہیں ملتی تھی۔ منشورات کواس کام کے لئے کئی ''رضا کار'' میسر آسکتے ہیں۔

مجموعی طور پر کتاب بے حد مفید ہے۔ ضروری ہے کہ ہر مدرس کے لیے ''نصاب'' میں شامل کی جائے۔ اجتماعی مطالعے میں بھی اس کے نکات پر بحث کی جاسکتی ہے۔ درسِ قرآن ہمارے گلی محلوں، مسجدوں اور اداروں میں جاری ہیں لیکن معمول کی ایک سرگرمی بن چکے ہیں۔ ان کو مفید، موثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے ایک ''مہم'' چلانے کی ضرورت ہے جس کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازم ہوگا۔

☆☆☆

# محترمہ عذرا سرفراز سجاد سے ایک ملاقات

عذرا سجاد صاحبہ سابق چیئر مین سینٹ وسیم سجاد کی اہلیہ ہیں۔ پرائیویٹ سکولوں میں تدریس کا طویل تجربہ رکھتی ہیں۔ شوہر کے ساتھ بیرونی دوروں میں متحرک اور فعال کردار ادا کیا اور تجربات و مشاہدات سے لبریز سیاحت کی۔ دین وملت کے لئے دردمند دل رکھتی ہیں۔ ہمارا ان سے تعارف ایک بین الاقوامی کانفرنس کے دوران ہوا، جس میں انہوں نے اصلاح معاشرہ کے حوالے سے قابلِ قدر خیالات کا اظہار کیا۔ پھر لاہور میں ان کے ساتھ ایک تفصیلی نشست میں جو گفتگو ہوئی وہ یہاں درج ہے۔ ان کی خوبصورت شخصیت اور تعمیری سوچ کی طرح انداز بیاں بھی ایک کہانی کار اور داستان گو جیسا ہے، جسے سمیٹ کر چند صفحات میں قلمبند کرنا مشاق کا متقاضی ہے۔ (مدیرہ)

س۔ سب سے پہلے تو قارئین بتول سے اپنا تفصیلی تعارف کروائیے؟

ج۔ میرا نام عذرا سرفراز سجاد ہے۔ میری پیدائش دہلی میں ہوئی۔ میری والدہ کا تعلق امرتسر سے ہے۔ میرے دادا ڈیرہ غازی کے زمیندار تھے۔ میری دادی کی وفات کے بعد دادا نے دوسری شادی کر لی۔ میرے والد سرفراز احمد ان کی پہلی بیوی سے اکلوتی اولاد تھے۔ بہت ذہین اور ہونہار تھے، پڑھنے کیلئے دہلی چلے گئے۔ چھٹیوں میں گھر واپس آئے تو وہاں نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ سوتیلی ماں نے سامان اٹھوا کر باہر کوارٹروں میں بھجوا دیا۔ باپ نے دوسرے دن مژدہ سنایا کہ گھر کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے آئندہ ان کی کفالت نہیں ہو سکے گی۔ اپنا انتظام خود کریں۔ وہ واپس ہاسٹل میں آ گئے اور پریشان رہنے لگے۔ بخار میں مبتلا تھے کہ ان کے دوست رفعت علی انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔ رفعت علی کے والد سید شجاعت علی حسنی نے ان کے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دئے۔ سوتیلی ماں کی تدبیر بچے کی تقدیر بن گئی۔ وہ جانتی نہ تھی کہ مقدر کی بلندیوں کی طرف جانے والی گھاٹیاں بن باس سے ہو کر بھی گزر سکتی ہیں۔

شجاعت علی حسینی انہیں اپنی بڑی بہن کے پاس لے آئے جن کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ وہ اس وقت تلاوت قرآن میں مشغول تھیں۔ شاہ جی سرفراز کو لیے ان کے پاس آ گئے، کہا، باجی! یہ سرافراز ہے آپ کا بیٹا، ساتھ ہی ان ہاتھ پکڑ کر ان کے سر پر رکھ دیا۔ بہن نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر قرآن پر رکھ دیا۔ دونوں طرف

آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ پھر قلم کے ساتھ اسی قرآن پر اپنا اور سرفراز کا نام لکھا گیا۔ یوں وہ دونوں ماں بیٹے کے رشتے میں بندھ گئے۔ ماں نے اپنی ساری ممتا بیٹے پر نچھاور کردی۔ بیٹے نے فرزندی کا حق ادا کیا تو اس جیسی مثال ملنا مشکل ہے۔ میرے والد سرفراز بہت محنتی تھے۔ ذہانت خداداد تھی۔ ماں کی دعائیں شاملِ حال ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسا نوازا کہ ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔

میرے نانا دہلی کے کامیاب تاجر تھے، وہیں پر ان کے دفاتر تھے۔ میرے نانا بہت خداترس آدمی تھے۔ انہوں نے بہت سی جھگیوں میں رہنے والی بچیوں کی شادیاں کروائیں۔ وہ غریبوں کا دکھ سمجھ سکتے تھے کیونکہ وہ سیلف میڈ آدمی تھے بعد میں وہ انڈیا کے کامیاب بزنس مین بنے۔

س۔آپ اپنے والدصاحب کی ملازمت کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج۔میرے والد سرفراز احمد نے عربی میں ایم اے کیا تھا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ نیوز سے وابستہ ہوئے۔ پھر پارٹیشن کے بعد سب سے پہلے کراچی آئے اور یہاں انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی کی بنیاد رکھی۔

کچھ عرصہ کے بعد انہیں دوجگہ سے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ ایک جاب سوئزرلینڈ کی تھی اور دوسری بغداد کی۔ دوستوں،عزیزوں نے جنیوا جانے کا مشورہ دیا کہ آئندہ کیلئے یہاں ترقی کے مواقع زیادہ ہیں مگر دادی جان بغداد جانا چاہتی تھیں کیونکہ وہ چاہتی تھیں کہ اگر وہ بغداد میں مرگئیں تو وہاں کی مٹی نصیب ہوگی لہٰذا والدصاحب نے بغداد جانے کا عندیہ دے دیا۔

میرے والد قائداعظمؒ کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ قائداعظمؒ انہیں بہت پسند کرتے تھے اور وہ بھی قائد سے بہت اٹیچ تھے۔ آل انڈیا ریڈیو قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان کی سرگرمیوں کا بائیکاٹ کرتا تھا جبکہ میرے والد وہاں بساط بھر قائداعظمؒ کو کوریج دینے کی کوشش کرتے۔ اسی لیے قائدؒ ان کی قدردانی کرتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے دنوں میں قائدؒ ہمارے گھر بھی تشریف لائے تھے۔ اب میں پرانی تصویریں اور دستاویزات دیکھتی ہوں تو اس بات پر بڑا فخر ہوتا ہے کہ ان دنوں جب تاریخ لکھی جارہی تھی، تو چند اہم فیصلے ہمارے گھر میں ہوئے تھے۔

بغداد سے انہیں ترکی بھیجا گیا اور پھر واپس

پاکستان بلا کر پاکستان ٹائمز کا چیف ایڈیٹر بنایا گیا۔ وہ گورنمنٹ سروس میں رہ کر امریکی پالیسی کو سپورٹ نہ کرنے والے افسروں میں تھے اسی لیے ان کو دوبارہ بیرون ملک ہالینڈ بھیج دیا گیا جہاں قدرت اللہ شہاب ان کے پاس تھے۔

س۔کیا آپ نے اپنی والدہ سے کچھ سیکھا؟

ج۔میری امی کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔سیدھے سادھے لوگ تھے میں جس ماحول میں پلی بڑھی، میں نے اپنی امی کو سسرال والوں کی خدمت کرتے دیکھا۔گھریلو ماحول تھا جہاں سچائی تھی، صاف گوئی تھی، ہر بات سیدھی اور صاف کی جاتی تھی۔یہی وجہ تھی جب میں نے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو مجھے لوگوں کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ ہمارے بزرگ خوفِ خدا رکھنے والے تھے۔ چار سال کی عمر میں دادی نے نماز سکھا دی تھی۔

س۔آپ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیں؟

ج۔میں نے کانونٹ آف جیسز اینڈ میری لاہور سے پڑھا ہے۔میں بہت چھوٹی تھی جب ہم بغداد چلے گئے وہاں کے برٹش سکول، بغداد اور انقرہ کے کالجوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔پھر لاہور کے کانونٹ سے سینئر کیمبرج کیا۔ ہنٹر کالج آف دی سٹی یونیورسٹی لندن سے جو اس وقت آل گرلز تھا سے لبرل آرٹ میں گریجوایشن کیا۔ انگلش اور مائنز ایجوکیشن میرے میجر سبجیکٹ تھے۔ جب میرے والد داخلے کیلئے مجھے یونیورسٹی لے کر گئے تو ڈین نے نہایت احترام سے ان کا استقبال کیا، اس دور میں بیرونی دنیا میں پاکستان کی بہت عزت تھی۔

س۔اپنی شادی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج۔ہماری ارینج میرج تھی۔ میری والدہ چاہتی تھیں لڑکا شریف ہو،شراب نہ پیتا ہو اور زیادہ پیسے والا نہ ہو۔ان کا کہنا تھا زیادہ پیسے والے لڑکے بگڑے ہوتے ہیں۔وسیم کے والد جج تھے۔وسیم نے آکسفورڈ سے ایل ایل بی اور لنکنز ان سے بارایٹ لا کیا۔تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہماری شادی 29 دسمبر 1968ء کو ہوئی۔وسیم کے نو بہن بھائی ہیں۔ان کے والد جسٹس سجاد احمد خان میرے والد کے دوست تھے۔

س۔اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

ج۔وسیم بہت سیدھے سادھے ، سچے انسان ہیں۔بہترین شوہر ہیں، ذمہ دار باپ ہیں۔

س۔اپنے بچوں کے بارے میں بتایئے؟

ج۔میرے تین بچے ہیں۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔بیٹی مریم نے ایم بی اے کیا ہے۔ وہ میری نہایت فرمانبرداری بیٹی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ میرے دونوں بیٹے بیرسٹر ہیں۔علی حسن سجاد اور عمر حسن سجاد۔

س۔وسیم سجاد صاحب سینٹ میں کب آئے؟

ج۔وسیم بنیادی طور پر بیرسٹر ہیں۔پارلیمنٹ میں 1980ء میں ضیاءالحق کے دور میں آئے۔ایک بار یہ جونیجو صاحب کو ریسیو کرنے ائیرپورٹ گئے تو جونیجو صاحب ان کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے۔انہوں نے ایک ہی ملاقات میں ان کی صلاحیتوں کو جانچ لیا اور انہیں سینٹ کا الیکشن لڑنے کے لیے کہا۔آپ سینٹ کے چیئرمین بھی رہے اور صدر کی عدم موجودگی میں پاکستان کے قائم مقام صدر بھی رہے۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت نوازا ہے۔دینے والی اللہ کی ذات ہے۔بس ہر معاملے میں ہماری نیت اچھی ہونی چاہیے۔

س۔شادی کے بعد کا کوئی واقعہ بتایئے؟

ج۔مجھے خریداری کرنا بالکل نہیں آتی تھی۔شادی کے بعد ایک بار میں بازار گئی تو میں نے چھ ہزار روپے کالٹھا اور ململ خرید لی،بس اتنی سی مجھ میں عقل تھی۔وسیم سیلف میڈ آدمی ہیں۔کینٹ میں ہم نے اپنا گھر بنایا تو کئی مراحل میں بنا۔زمین والد صاحب نے دی تھی اوپر عمارت ہم نے بنوائی۔کبھی دروازہ لگالیا،کبھی کھڑکی،کبھی فرش بنوالیے۔اس طرح ہم نے اپنا گھر مکمل کیا۔

س۔آپ کیا سمجھتی ہیں۔زندگی میں کون سا اصول اپنانے سے معاشرے میں بہتری آسکتی ہے؟

ج۔سچائی کا اصول۔ایک بار میں خریداری کیلئے گئی تو دکاندار نے کپڑے کی قیمت دگنی چوگنی بتائی میں نے اسے کہا کہ سچ بات کرنی چاہیے، صحیح قیمت بتانی چاہیے،اس سے مال سے برکت ہوتی ہے۔سچ بول کر دیکھ، پورا تول کر دیکھ، دیکھ مولا تیرا کرتا ہے کیا۔دکاندار کہنے لگا آپ نے کتنی اچھی بات کہی ہے، آپ اسے پرنٹ کروا کر ہمیں دیں ہم دکان میں لگائیں گے۔

س۔آپ کو لوگوں کا کون سا رویہ دکھی کرتا ہے؟

ج۔ہم سچ بولنے سے ڈرتے ہیں، سیدھی بات نہیں کرتے، ہمارا یہ اصول نہیں رہا، یہی بات مجھے دکھی کرتی ہے۔ہمارے ہاں لوگ حلال چاہتے ہیں مگر سچ اور ایمانداری کا خمیازہ اٹھانے سے ڈرتے ہیں۔

س۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے یہاں

سینٹ کاالیکشن لڑنے جارہے ہیں تو آپ کو کیسا لگا؟

ج۔ مجھے یہ خبر ملی تو میں نے رونا شروع کردیا۔دعا کی کہ یااللہ وسیم الیکشن ہار جائیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ سینٹ کیا ہوتا ہے مگر وسیم فیصلہ کرچکے تھے۔الیکشن میں صرف چار دن باقی تھے۔میں نے سوچا چار دنوں میں یہ کیا الیکشن لڑیں گے۔میری ایک سہیلی نے کہا دعا کرو جو بھی ہو بہتر ہو۔ میں نے دعا مانگ کر قرآن کھولا تو سامنے یہ آیت آئی۔

''کیا ہم نے تمہیں یتیم نہیں پایا پھر اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دی۔''(الضحیٰ)

میں نے اپنی ساس کو بتایا کہ یہ آیت آئی ہے انہوں نے تسلی دی کہ خوش خبری ہے۔

بالآخر معلوم ہوا کہ بہت معمولی مارجن سے وسیم الیکشن ہار گئے ہیں،وہ ٹیکنو کریٹس کے لئے مخصوص دوسیٹوں میں سے ایک کے لیے نامزد ہوئے تھے۔بہر حال اس الیکشن میں ہمارے بارہ ہزار سات سو روپے خرچ ہوئے۔میں بہت خوش تھی ان کے ہارنے پر جبکہ وسیم بہت اداس تھے۔اگلے ہی روز ہمیں کینیڈا جانا تھا وسیم کے بھائی کو بلڈ کینسر تھا،ہم نے ان کے لیے بلڈ لے کر جانا تھا۔ہم لوگ کینیڈا چلے گئے۔وہیں ائیر پورٹ پر میرا اٹیچی گم ہوگیا۔جس میں میری ضرورت کی تمام اشیاء تھیں مجھے اس کی بہت پریشانی تھی۔انہی دنوں وسیم سکھوں کا کیس لڑ رہے تھے ہمیں نیویارک سے ویسٹ کوسٹ جانا پڑا۔ہم سکھوں کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔صبح وسیم اخبار لینے چلے گئے۔اتنے میں وسیم کے بھائی کا فون آیا میں سمجھی میرے بکس کے بارے میں انہوں نے فون کیا ہے لیکن انہوں نے بتایا کہ وسیم سینٹ کاالیکشن جیت گئے ہیں۔ان کے حریف نے دعویٰ کیا تھا کہ الیکشن غلط ہوا ہے،دوبارہ گنتی کی جائے۔

س۔سینٹ کے چیئرمین کی بیوی کی حیثیت سے آپ کے کیا احساسات تھے؟

ج۔میں اللہ تعالیٰ کی بہت شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نوازا ہے۔ مجھے اس بات کا بہت احساس تھا اسی احساس اور جذبے کے تحت میں انسانیت کیلئے اس ملک کے لوگوں کیلئے خصوصاً نوجوان نسل کیلئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔میری بے حد خواہش تھی کہ پاکستان کے سکولوں میں ''اخلاقیات'' کا مضمون متعارف کرواؤں۔میں نے نوجوانوں کے رویے میں تہذیب واخلاق کی بہت کمی دیکھی ہے۔میں ایچی سن کے پرنسپل کے پاس گئی اور کہا کہ آپ اپنے سکول میں Ethics کی

بطور مضمون ابتدا کریں۔وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے انگلش لٹریچر اورلبرل آرٹ پڑھا ہے، میں سمجھتی ہوں کہ یہ مضمون بچوں کے لیے بہت ضروری ہے۔اس سے سوچ کے نئے زاویے کھلتے ہیں۔ ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔میری خواہش سن کر پرنسپل نے کہا آپ انٹرویو کیلئے آجائیں۔میں نے بتایا کہ میں نوکری نہیں چاہتی یہ کام آپ شروع کریں۔

س۔کیا آپ سمجھتی ہیں ہمارے ملک کا نظام تعلیم درست ہے؟

ج۔ہمارے ملک کے نظام تعلیم میں بہت زیادہ خرابیاں ہیں۔آپ کبھی سکولوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سکولوں کی حالت بہت بری ہے۔ٹائمنگ بہت کم ہیں۔سکول کا وقت زیادہ ہونا چاہیے۔معاشرے کی مجموعی صورت حال بھی تو خراب ہورہی ہے۔ پہلے بچے گھروں سے اخلاقی سبق سیکھتے تھے۔جوائنٹ فیملی سسٹم ہوتا تھا۔اپنے بزرگوں کی عزت واحترام ،ادب، تمیز اورتہذیب سبھی گھروں میں سکھایا جاتا تھا اب بچے سب کچھ ٹی وی سے سیکھ رہے ہیں اور ٹی وی پر جو کچھ دکھایا جارہا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔میں نے لڑکوں کو اور لڑکیوں دونوں کو ایتھکس پڑھائی،لڑکوں نے پڑھنے کے دوران بہت تنگ کیا ان کے لیے تو ایتھکس پڑھنا بہت ضروری ہے۔ان کے غلط رویے کی وجہ سے ٹیچرز روپڑتی ہیں۔ بچوں کی تربیت میں ماں کا کردار زیادہ ہوتا ہے۔بچوں کی اخلاقی حالت اتنی بدتر ہے کہ پیرنٹ ٹیچر میٹنگ میں اکثر اساتذہ بچوں کی شکایت لگاتے ہوئے روپڑتی ہیں۔ یہ مضمون ہر سکول کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے اس سے زیادہ ضروری اورکوئی مضمون نہیں ہے۔

س۔آپ نے کتنے عرصے تک پڑھایا؟

ج۔میں نے تقریباً چودہ سال تک اسلام آباد کے سکولوں میں پڑھایا ہے۔ دوسال بیکن ہاؤس میں اور بارہ سال او پی ایف میں۔اس کے علاوہ پی اے ایف سکول، راولپنڈی میں وزیٹنگ فیکلٹی کے طور پر سات سال کام کیا۔

س۔آپ نے بیرون ملک کے بہت سے سکولوں کو دیکھا،ان کے تعلیمی نظام کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج۔جی ہاں! میں تقریباً چالیس ملکوں میں گئی ہوں اور ہر جگہ جا کر میں وہاں کے سکول ضرور دیکھتی تھی۔بہتر

تعلیمی نظام میں سویڈن دنیا کے نمبر ایک ممالک میں آتا ہے۔انہوں نے تعلیمی نصاب بنانے میں پانچ سال لگائے جس میں ''اخلاقیات'' سرفہرست ہے۔انڈیا اور جاپان میں بھی یہ مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ہم لوگ جب جاپان کے دورے پر گئے تو سفیر نے مجھے سکول کا وزٹ کروایا۔سکول میں تمام بچے جوتے اتار کر کلاسوں میں جاتے۔سکول کی صفائی سب بچے مل کر کرتے۔دنیا میں ایسا کہیں بھی نہیں ہے کہ جیسے مرضی سکول چلالو۔ٹرکش سائپرس میں بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں وہاں کے اساتذہ بہت کوالیفائیڈ ہیں۔امریکن سچ بولنے کو پسند کرتے ہیں۔ان کے منہ پر بات کہہ دو تو برا نہیں مانتے۔

س۔کیا آپ پاکستان کے تعلیمی نصاب میں کچھ تبدیلیاں دیکھ رہی ہیں؟

ج۔جی ہاں پاکستان کے تعلیمی نصاب میں بہت سی ایسی بگاڑ پیدا کرنے والی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جو نہیں ہونی چاہئیں۔یو ایس ایڈ کے تحت بہت کچھ غلط چیزیں نصاب میں شامل ہیں۔بچوں کو جنسی تعلیم دی جارہی ہے۔ان کے پیچھے برٹش مشینری کام کر رہی ہے۔ایک بہت بڑے مافیا نے ہمیں جکڑ رکھا ہے۔ان کا نیٹ ورک بہت مضبوط ہے۔ہم لوگ اپنی تہذیب اور دین سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ان پر فوری طور پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔یہ لوگ پاکستان کی شناخت ختم کرنا چاہتے ہیں۔انہوں نے یہ پروگرام انڈیا کو بھی دیا مگر انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

س۔آپ تعلیمی نظام بہتر بنانے کے لئے کوئی تجاویز دینا چاہیں گی؟

ج۔میں پاکستان کو اسکی اصل شناخت کے حوالے سے دیکھنا چاہتی ہوں۔سب سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ مخلوط تعلیم والے سکول فوری طور پر بند کیے جائیں۔آج بھی امریکہ میں بہت سے کالجز اور یونیورسٹیاں مخلوط نہیں ہیں۔لڑکیوں کا لباس حیادار ہو۔لڑکیوں کیلئے سکول کالج جانے کیلئے اوورکوٹ لازمی ہو۔سکولوں، کالجوں میں بے حیائی کے کام جیسے میوزک شو،فیشن کیٹ واک اور ایسی دیگر سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے۔سارے ملک میں ایک جیسا نصاب تعلیم ہو۔بچوں کیلئے پبلک ٹرانسپورٹ مہیا کی جائے۔حکومتی سطح پر ایک کمیشن ہیلتھ ایجوکیشن پر کام کرے۔پہلی پانچ جماعتیں ہر ایک کیلئے ضروری قرار پائیں۔چھٹی کلاس سے آٹھویں تک مڈل سکول، نویں سے بارہویں

جماعت تک ہائی سکول ہونے چاہئیں۔ اپنی قوم کے لئے خود اصول طے کریں۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں وہاں کے ماحول اور حالات کے مطابق تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ افراد کو ہنرمند بنایا جائے۔ لڑکیوں کیلئے گھریلو دستکاریوں کو فروغ دیا جائے۔ ہرلڑکی ہنرمند ہو، ہرلڑکے کو کسی نہ کسی کا کام میں مہارت حاصل ہو۔ انہیں وقت کی قدر کرنا سکھائیں۔ صفائی کے اصول سکھائیں۔ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو نصاب تعلیم ہماری قومی زبان اردو میں ہو۔

س۔آپ کو بہت سے ممالک میں جانے کے مواقع ملے آپ وہاں کے سربراہانِ مملکت سے بھی ملیں۔کیا آپ ہمیں ان ملاقاتوں کے بارے میں بتائیں گی؟

ج۔جی ہاں ضرور۔سب سے پہلے جنوبی افریقہ کے نیلسن منڈیلا کے بارے میں بتاؤں گی۔ہم منڈیلا صاحب کو ملے ان سے ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی۔ میں نے ان سے کہا،آپ نے اتنی اذیت برداشت کی ہے،ظلم سہا ہے، چوبیس سال دھوپ میں پتھر توڑے ہیں، کیا آپ یہ سب کچھ بھول پائے ہیں؟انہوں نے جواب دیا ہاں بھولنا مشکل تھا مگر ضروری بھی کیونکہ مجھے آگے کو سفر کرنا ہے۔میرے دل کو ان کی یہ بات اچھی لگی۔

ان دنوں رمضان کا مہینہ تھا افطاری کے وقت وہاں روایتی کھانے رکھے جا رہے تھے۔ان لوگوں میں وہ انڈین بھی تھے جو آج تک کبھی انڈیا نہیں گئے تھے مگر ان کا لباس ان کے اپنے ملک کا تھا۔انہوں نے کہا ہم اپنی شناخت گنوانا نہیں چاہتے۔ان میں سے کئی لوگ مسلمان تھے۔ہم وہاں مسجد کی تلاش میں تھے۔ہم نے پوچھا کیا یہاں نماز پڑھنے کیلئے مسجد ہوگی؟منڈیلا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ یہاں مسجد ضرور بنوائیں گے۔ان دنوں وہ نئے نئے جیل سے باہر آئے تھے۔

اسی طرح ہمارا جاپان جانا ہوا تو مجھے وہاں پاکستانی کلچر متعارف کروانے کے لیے سکول کا وزٹ کروایا گیا۔ سکول میں ہمارے پاکستانی وفد کو بہت عزت دی گئی۔یہ ایلیٹ کلاس کا سکول تھا۔سکول کے تمام بچے جوتے اتار کر کلاس میں آکر بیٹھے تھے۔

اس کے بعد جاپان کے بادشاہ اور اس کی بیگم سے ملنے ان کے پیلس لے جایا گیا۔ بادشاہ اور ملکہ ہمارے استقبال کیلئے کھڑے تھے۔ وسیم بادشاہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے اور مجھے ملکہ کے ساتھ بٹھایا گیا۔ترجمان

کی مدد سے ہماری بات چیت ہوتی رہی۔کوئین مجھ سے ایسے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں جیسے میری کوئی پرانی سہیلی ہوں۔ میرے بارے میں انہیں پوری معلومات تھیں وہ ملاقات سے پہلے میرے بارے میں سب کچھ جان چکی تھیں۔میں نے اپنے قومی شاعر اقبالؒ کی بات کی اورانہوں نے کسی جاپانی شاعر کے بارے میں بتایا۔وہ بہت مذہبی خیالات کی مالک تھیں۔انہوں نے بتایا میرا بیٹا شادی نہیں کرتا۔اس کیلئے میں فکرمند ہوں۔بادشاہت کیلئے بھی نہیں مان رہا۔انہوں نے بچوں کے مسائل اورصحت کے معاملات پر بھی بات کی ان کی اور میری ایک بیماری مشترکہ تھی جس پر ہم نے کافی دیر بات کی۔انہوں نے بتایا کہ یہ شاہی خاندان دوہزار سال سے چلا آرہاہے۔میں نے انہیں اسلام کے بارے میں بتایا اور اسلام سے ان کی لاعلمی پر حیرت ہوئی۔ میں نے انہیں اقبالؒ پر لکھی ہوئی کتب تحفہ میں دیں۔

س۔کیاامریکہ بھی جانا ہوا؟

ج۔جی ہاں !امریکہ کا ایک سوچالیسواں یوم آزادی منایا جارہاتھا۔سپیشل روڈز اسکالرشپ والوں کی میٹنگ تھی۔ہر ملک سے ایک یادونمائندے موجود تھے۔ لوگ لیکچر سن کر باہر آرہے تھے۔ میرے ساتھ ایک امریکن عورت چل رہی تھی۔ میں نے اسے کہا ہمارے ملک میں بم بلاسٹ ہورہے ہیں اور یہاں ہیومن رائٹس کی باتیں ہورہی ہیں یہ ہمارے اوپر ڈرون بھی پھینکتے ہیں اورامن کی باتیں بھی کرتے ہیں۔وہ امریکن سنیٹر نمائندہ تھی اس نے مجھے کہا آپ یہ لکھ کر دیں۔میں نے سکول کے بچوں سے چٹھی لکھوائی اور بچوں سے کہااس پر سب اپنا نام بھی لکھیں لیکن انہوں نے نام لکھنے سے انکار کردیا۔میں نے کہا میں بھی تو لکھ رہی ہوں مگراس خاتون نے مجھے بھی نام نہیں لکھنے دیا، کہا اگر تم نام لکھ دیتیں تو تمہیں بہت تنگ کرتے وہ ایک ایک چیز کا ریکارڈر کھتے ہیں۔

وہیں میں نے ایک لبنانی بچی کا ٹی وی انٹرویو دیکھا جو بہت رورہی تھی اوراپنے اوپر ہونے والےظلم کی داستان سنارہی تھی۔امریکن ظلم بھی کرتے ہیں اور دکھا بھی دیتے ہیں۔اس تقریب میں کلنٹن اور ہیلری بھی شریک تھےاورسوالوں کے جواب بھی دے رہے تھے۔ میں آگے بڑھی اورمیں نےکلنٹن سے پوچھا،آپ انسانی حقوق کے علمبردار ہیں،عراق کی زمین تباہ کردی گئی ہے۔ اس کا کیا جواز دیں گے؟ اس نے کہا

یو آر رائٹ...... یو آر رائٹ...... میں امن چاہتا ہوں۔

اب میں سوچتی ہوں، آخر وہ اس سوال کا کیا جواب دیتا! میں ڈر گئی کہ کوئی میری شکایت وسیم سے نہ کردے اور واپس آ گئی لیکن میں بے چین تھی کہ میں اپنی بات کہہ نہیں سکی۔ میں نے وسیم سے کہا اگر آپ کہیں تو میں کلنٹن کو خط لکھ دوں۔ انہوں نے کہا لکھ دو، میں نے خط لکھ کر وسیم کو پڑھوا بھی دیا۔ یوں میں نے اپنا پیغام خط کلنٹن تک پہنچا دیا۔ میں نے خط میں لکھا تھا کہ آپ دہشت گردی کی تعریف بتائیں؟ جب ہم پاکستان واپس آئے تو ڈیسک پر خطوط رکھے تھے ان میں کلنٹن کا خط بھی تھا۔ اس نے جواب میں لکھا تھا'' آپ سے مل کر بہت اچھا لگا''، مگر میرے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

س۔ آپ لندن بھی گئیں وہاں کی کوئی خاص یاد ہمیں بتائیں؟

ج۔ لیڈی ڈیانا کی موت کے بعد ہمارا لندن جانا ہوا۔ کوئین الزبتھ سے ملاقات ہوئی۔ ہم دس بارہ لوگ تھے جب کوئین سے ملاقات ہوئی تو ان کے ہاتھ میں ایک پھول تھا۔ جو ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا، میں فوراً پھول اٹھانے کیلئے جھکی تو مجھ سے پہلے کوئین نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ ان کی اس بات سے میں متاثر ہوئی۔ میں نے ان سے بچوں کے بارے میں پوچھا مگر ڈیانا کے بارے میں کوئی بات نہ کی کیونکہ فارن آفس سے مجھے خاص فون آیا تھا کہ کوئین سے ڈیانا کے بارے میں کوئی بات نہ کی جائے۔ میں چاہتے ہوئے بھی ان سے کچھ نہ پوچھ سکی کیونکہ میں اس سے پہلے ڈیانا سے اس کی زندگی میں مل چکی تھی۔

مجھے معلوم ہوا کہ جن دنوں کرسمس تھی پیلس میں بڑے پیمانے پر کرسمس منائی جا رہی تھی مگر انہوں نے ڈیانا کو کرسمس کی تقریبات میں نہیں بلایا تھا۔ ڈیانا Street Kitchen (لنگر) میں اپنی کرسمس منا رہی تھی۔ غریب بچوں کو سوپ پلاتے ہوئے اس نے یہ دن گزارا تھا۔ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا تھا۔ جن دنوں ڈیانا کا پاکستان آنا ہوا تب میری اس سے ملاقات ہوئی۔ سفارتخانے کی پارٹی میں وہ آئی تھی۔ ڈیانا مجھ سے بچوں کے بارے میں بہت باتیں کرتی رہی۔ جب وہ پاکستان پہنچی تو اس نے لمبا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ لیکن جب اسے بادشاہی مسجد لے جایا گیا تب اس نے شارٹ سکرٹ پہن رکھی تھی جو مناسب نہ تھی وہ علی الصبح چھ بجے اٹھتی، سوئمنگ کرتی پھر دوسرے کام کرتی۔ ایک ساؤتھ کورین نے ہمیں بتایا کہ میاں بیوی کے تعلقات ٹھیک

نہیں ہیں دونوں الگ الگ کمروں میں رہتے ہیں۔

میرا خیال ہے ڈیانا مرنے سے پہلے اسلام کے کافی قریب آ چکی تھی۔لوگوں نے اسے ٹی وی پر اکبر ایس احمد کے ساتھ دیکھا جو مشہور سکالر اور بہت سی اسلامی کتب کے مصنف بھی ہیں۔ ڈیانا نے اسلامی کتب تھامی ہوتی تھیں۔جن دنوں ہم پیرس گئے انہی دنوں ہمارا میزبان ایک گورا میرے ساتھ ساتھ تھا اور میں اس سے گوروں کی بدتعریفیاں کررہی تھی۔میری تمام باتیں سننے کے بعد اس نے مجھ سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ میری بیوی ڈیانا کی بہن ہے۔

س۔میڈیا کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گی؟

ج۔آجکل ٹی وی پر جو کچھ دکھایا جارہا ہے،مہذب لوگ اپنے گھروالوں کے ساتھ بیٹھ کر اسے نہیں دیکھ سکتے۔میڈیا پر جو بھی دکھایا جائے گا ہمارے بچے بھی وہی کچھ کریں گے۔ ہمارے دین میں حیا کا ذکر آیا ہے۔ہمارے معاشرے میں حیا ختم ہوچکی ہے۔میں نے ایک شادی پر ایک نوجوان لڑکی کو نیم برہنہ کھڑے دیکھا تو میں شرم سے گڑ گئی وہ لڑکی پارکنگ میں کھڑی تھی تمام ڈرائیورز مڑمڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ہماری بچیاں اپنی شناخت بھول چکی ہیں کہ وہ پاکستان اور مسلمان لڑکیاں ہیں۔ہمیں اپنی دینی اقدارروایات اور اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کے لئے فکرمند ہونا چاہیے۔ہم تو مسلمان ہیں،جبکہ دنیا بھر میں یہ رجحان ہے کہ سنجیدہ گھرانے بے حیائی کے کلچر سے تنگ آ چکے ہیں۔امریکہ میں میرے کئی دوستوں نے گھروں سے ٹی وی نکال دیا ہے۔

س۔بتول کے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں؟

ج۔میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم باضمیر قوم بنیں۔مسلمان آج ہر جگہ ظلم اور زوال کا شکار ہیں۔ یہ اپنے دین کا دامن چھوڑ دینے کی وجہ سے ہے۔میں دنیا بھر میں جہاں بھی گئی اپنے ساتھ قرآن پاک کے نسخے لے کر جاتی تھی اور وہاں سفارتی اور حکومتی عہدیداروں کو تحفتاً دے کر آتی۔دین پر چلنے میں ہی راہ نجات ہے۔

آپ سے ملاقات بہت خوشگوار رہی۔آپ کے وقت کا بہت شکریہ۔

☆☆☆

# امریکی تہوار

''آمنہ باجی ٹرکی کھائی تھی؟'' عفیفہ (آپا فیروزہ کی بیٹی) کی فون پر آواز آئی۔

''ایک دفعہ کھائی ہے دوسری دفعہ کھانے کی آرزو نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیوں آمنہ باجی! مجھے تو ٹرکی کھانے کا بہت شوق ہے۔''

''شوق ہمیں بھی بہت تھا مگر کھا کے بے مزہ ہوئے۔'' میں نے کہا۔ سوٹرکی کے ذکر پر عفیفہ نے ہمیں دعوت دی کہ سفرِ امریکہ پر لکھوں۔

اس دفعہ امریکہ گئی تو Halloween کا خوب چرچا تھا۔ سٹور عجیب وغریب مکروہ چیزوں سے سجے تھے۔ مثلاً مکڑی، مکڑی کا جالا، بھوت، چھپکلا، چڑیلیں، جادوگرنیاں، خون سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں اور باہر کو نکلے ہوئے بڑے بڑے دانتوں والی ڈائنوں کے کاسٹیوم، ان کے علاوہ سات شہزادیوں کے مختلف ڈریسز، کدو، بینگن، مالٹا، کیلا، سبزیوں اور پھلوں کے متعلق لباس، میری بہن ساتھ ہوتی تھی بتاتی رہتی کہ یہ سب دکانداری ہے یہ سب ہر سال نئے ڈیزائن میں آتے ہیں اور سالِ گزشتہ کے متروک سمجھے جاتے ہیں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے کچھ لوگوں نے اپنے گھروں کے باہر میرے خیال کے مطابق چڑیل گھر بنا لیے۔ گھروں کے سامنے یارڈ میں جالا تنا ہوا ہے، موٹی سی کالی مکڑی جالے میں موجود ہے۔ بڑا سا چھپکلا، ڈائنیں، بھوت، الو، چوہے جیسے چھوٹے موٹے جانور جو جادو وغیرہ کے عمل میں مطلوب ہوتے ہیں، زمین اور درختوں پر موجود تھے۔

یہ دن شیطان کو خوش کرنے کے لیے منایا جاتا ہے تاکہ وہ ان پر سارا سال مہربان رہے اور ان پر مصیبتیں نازل نہ کرے۔ یہ رات کی تقریب ہے سکول میں چھٹی نہیں ہوتی۔ بچے مختلف کاسٹیوم پہن کر سکول جاتے ہیں کوئی بھتنا بنا ہے تو کوئی جادوگرنی، کوئی ڈائن تو کوئی شہزادی، کوئی کدو بنا ہے تو کسی نے بینگن، کیلے یا مالٹے کا کاسٹیوم پہنا ہوا ہے گویا ''چند احمق جمع شدند اُورا

گویند میلا۔"

شام ہوتے ہی بچے گھروں سے ٹوکریاں پکڑے چہروں پر مختلف ماسک سجائے کاسٹیوم پہنے کینڈیاں لینے آس پاس کے گھروں میں جاتے ہیں یہ شیطان کی کینڈی کہلاتی ہے جو اس کو خوش کرنے کے لیے تقسیم کی جاتی ہے گویا یہ شیطان کے نام کا صدقہ ہے۔ میری بھانجی بتارہی تھی کہ پورا مہینہ مسجد والوں نے Halloween کے متعلق بتایا کہ یہ شیطان کا دن ہے اسے نہیں منانا اور شیطان کے نام کی کینڈی نہیں کھانی۔ عفیفہ سے معلوم کر کے دل بہت رنجیدہ ہوا کہ ہمارے کالجوں کے طالب علم یہ جشن مناتے ہیں صرف مغرب کی نقالی میں۔ میں نے قلم صرف اس لیے اٹھایا ہے کہ شاید کوئی میرا یہ مضمون پڑھ کر ان ہیلووِن، تھینکس گوِنگ، ویلنٹائن ڈے، ایسٹر، مدر اور فادر ڈے جیسی خرافات سے بچ جائے جن کے متعلق خود اہل مغرب کہتے ہیں کہ ہم نے یہ رسمیں کافر قوموں سے لی ہیں یہ ہمارے مذہب کا حصہ نہیں ہیں۔

یہ سب اہل مغرب کے تاجروں کی دکانداری ہے جو وہ چمکا رہے ہیں اور ہم بغیر سوچے سمجھے اس کے پیچھے جارہے ہیں۔

اچھا جی اب Hallowe'en کی رات ختم ہوتے ہی سیل شروع ہو جائے گی۔Hallwoe'en کا سٹیوم اور قسم قسم کی کینڈیوں کی کہ اب تاجر چاہتا ہے کہ جتنی جلدی ہو یہ چیزیں ٹھکانے لگیں تا کہ وہ Thanksgiving کی چیزیں سجا سکیں۔

Thanksgiving کی وجہ تقریب یہ ہے کہ امریکیوں نے پہلے پہل اپنی بوئی فصل کاٹی تھی۔

اب سٹورز اور مالز Thanksgiving کی چیزوں سے بھرے جارہے ہیں جن میں برتن خصوصاً شامل ہیں۔ بڑی بڑی Trays، کپ، باولز، پکانے کے بڑے بڑے برتن، چائے، کافی کے برتن، زیورات، پرس، کپڑے، بچوں کی گیمز، کھلونے، پانی بھر کر رکھنے کے بڑے بڑے جگوں کی طرح برتن۔ سٹوروں میں بڑے بڑے پیٹھے اتنے گہرے زرد کہ شک ہوتا کہ یہ مصنوعی ہیں ڈھیر کے ڈھیر پڑے تھے،ان کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے جیسا کہ چھوٹا خربوزہ ہوتا ہے رنگ سب کا گہرا زرد۔ اب یہ پیٹھا اور ٹرکی Thanksgiving کا اہم جز ہیں۔ پیٹھے سے کیک اور مختلف مٹھائیوں کے علاوہ چائے تک بنتی ہے جس کا ایک ایک کپ پانچ ڈالر تک ہوتا ہے۔

ٹرکی ایسا ہی اہم جز ہے جیسا کہ عیدالاضحیٰ پر ہمارا بکرا ہوتا ہے۔ یہ وہاں اہم دن ہے اس پر تین چھٹیاں ہوتی ہیں کوشش ہوتی ہے کہ سب خاندان جمع ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہاں پر مسلمان بھی اسے اسی طرح مناتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ چھٹیاں ہوتی ہیں اور خاندان جمع ہوسکتا ہے۔ یہ تقریب ڈنر کے طور پر منائی جاتی ہے سب اہل خاندان اکٹھے ہوتے ہیں۔ٹرکی بنائی جاتی ہے جسے سب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

میری بہن کی ایک پاکستانی سہیلی نے جس کا خاوند انگریز مسلمان ہے، ہمیں بڑی پر جوش دعوت دی۔ بہن نے کہا کہ چاول میں بنا کر لاؤں گی۔نمازِ مغرب کے بعد ہم ان کے گھر گئے۔ٹرکی کا بہت شوق تھا (راستے میں جہاز میں ٹرکی سینڈوچ کھایا تھا جو مزے کا تھا) ٹرکی ایک بڑی سی ٹرے میں سجادی گئی، پوری کی پوری۔ ہر ایک نے اس میں سے خود کاٹا تھا۔میری عادت ہے کہ میں نئی چیز بالکل تھوڑی سی لیتی ہوں تا کہ اگر پسند نہ آئے تو گراتے ہوئے افسوس نہ ہو۔ میں نے ذرا سی کھانے کے لئے منہ میں ڈالی تو بالکل پھیکی، بے مزہ، نہ نمک، نہ مرچ، نہ آئل، بس ابلی ہوئی۔منہ میں ڈالا ہوا نگلنا مشکل ہوگیا، باقی خاموشی سے گرا دی۔ چاول ڈالے اور کھائے۔پھر میز پر ایک اور چیز نے متوجہ کیا، ایسے محسوس ہوا جیسے ابلی ہوئی سویاں ہوتی ہیں (جیسے آج کل نوڈلز ابال کر کھائے جاتے ہیں اسی طرح، اسی طرح ہم سرائیکی سویاں ابال کر چینی اور گھی ڈال کر کھاتے ہیں) میں نے وہ بھی ذرا سی اٹھائیں کیونکہ مجھے رغبت نہیں، منہ میں ڈالیں تو نگلنا مشکل ہوگیا کوئی ابلی ہوئی پھیکی چیز تھی بالکل بدمزا۔ اس کے بعد کچھ ڈیزرٹ تھے از قسم کیک اور آئس کریم وغیرہ۔ چلیں جی Thanksgiving ڈنر اختتام کو پہنچا۔

اہل خانہ سے بڑے ذوق شوق سے ٹرکی پکانے کی ترکیب پوچھی تو بتایا پوری ٹرکی کو اوپر سے زیتون کا تیل لگایا اوپر ہی اوپر سے تھوڑا سا نمک اور شاید لیموں بھی لگایا اور اس پوری کو اٹھا کر اوون میں رکھ دیا۔اب وہ ذرا سا تیلِ زیتون اور نمک اتنے بڑے پرندے کا کیا بگاڑتا۔ پھر بڑے شوق سے ان سویوں کی ترکیب پوچھی اس نے جھٹ ٹوکری سے پورے کا پورا سکاش نکال کر دکھایا یہ ایک عجیب قسم کا گہرا زرد اور سبز رنگ کا ہی صراحی نما کدو ہی سمجھ لیں، اس کو اوون میں پکایا پھر چھری اس کے اندر پھیر پھیر کر اسکو باہر نکال لیا سکاش سے جو نکلا قدرتی طور پر اس کی شکل سویوں کی تھی جس پر ہم دھوکہ

کھا گئے۔

چلیں جی اب ذکر ہو بلیک فرائی ڈے نائٹ کا۔ جونہی ڈنر ختم ہوتا ہے بلکہ اب تو ڈنر بھی ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اب یہ رات آٹھ بجے سے ہی شروع ہو جائے گی پہلے یہ رات کو 12 بجے شروع ہوتی تھی لیکن پیسے کے پجاریوں کو اب اتنی جلدی ہے کہ انہوں نے پہلے سے 4 گھنٹے بڑھا دیئے ہیں بہت لوگوں نے احتجاج کیا بلکہ لوگوں سے کہا کہ وہ اس میں شرکت نہ کریں کیونکہ اس طرح خاندان جو سال میں صرف ایک بار اکٹھا ہوتا ہے وہ مل کر کھانا بھی نہیں کھا سکے گا۔ اور Black Friday Night میں شرکت کے لئے نکل کھڑا ہوگا۔ دکانداروں کو اب جلد ہے کہ تھینکس گونگ کا سامان نکلے تو وہ سٹورز اور مالز کو کرسمس کی چیزوں سے بھریں۔ تھینکس گونگ کی چیزوں میں دنیا جہان کا سامان شامل ہے۔ کپڑے، جوتے، کاسمیٹکس، برتن، ہر قسم کے فون، کمپیوٹر، کھلونے، غرض دنیا کی ہر چیز اب یہ چیزیں نکالنی ہیں اصل قیمت سے دوگنا چوگنا وصول کر چکے ہیں لیکن باقی سامان بہت پڑا ہے جو بلیک فرائیڈے نائٹ پر فروخت ہوگا یہ تقریب ہمیشہ جمعہ کی رات کو ہی آتی ہے۔

میں نے بہن سے اس کا مطلب پوچھا تو اس نے بتایا کہ دکاندار کہہ رہا ہے کہ میں اتنی سستی چیزیں بیچ رہا ہوں کہ میرا دیوالیہ نکل گیا ہے میرے لیے اندھیر ہی اندھیر ہے۔ حالانکہ یہ لوگ حقیقتاً آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام تک وصول کر چکے ہوتے ہیں۔

اس رات سٹوروں کے باہر لمبی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ سردی کے باوجود لوگ سٹوروں کے باہر جمع رہ کر اپنے نمبر کا انتظار کرتے ہیں ساری رات وہاں گزار کر بقول دکاندار اس کا دیوالیہ نکال کر صبح گھر لوٹتے ہیں۔

اس رات کو چونکہ سارا خاندان جمع ہوتا ہے تو تنہا لوگ خصوصاً بوڑھے (کیونکہ جوان تو تنہا نہیں ہو سکتے) بہت ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں۔ میرا بھائی بتا رہا تھا (وہ وہاں مکان کرایہ پر دینے والی کمپنی میں مینجمنٹ کا کام کرتا ہے) گزشتہ سال Thanks Giving کے کچھ دنوں بعد کمپنی کا فون آیا کہ فلاں مکان میں جو بوڑھی عورت رہتی ہے اسے فون کرتے ہیں تو وہ فون نہیں اٹھاتی، تم اس کا پتہ کرو۔ (وہاں کمپنی والے گاہے بگاہے تنہا لوگوں کو فون کر کے ان کی زندگی کی تصدیق کرتے رہتے ہیں) امین نے کہا تم اپنا بندہ بھیجو میں چابی دے دوں گا۔ انہوں نے ایک خاتون بھیج دی۔ اب امین کو اس کے ساتھ جانا تھا۔ امین کہتا ہے کہ

دروازے پر جا کر میں نے کہا۔ اب اندر خود جاؤ میں نہیں جاسکتا۔ وہ عورت جب اندر گئی تو وہ کمزور سا وجود پھول کر کپا ہو چکا تھا۔ ہاتھ میں فون تھا زمین پر اوندھی گری ہوئی تھی (وہ عورت امین نے دیکھی ہوئی تھی بہت کمزور سی تھی) بھائی نے بتایا کہ اس دن بہت لوگ ڈپریشن کی وجہ سے موت کا شکار ہوتے ہیں پتہ نہیں وہ غریب کسی کو فون کر رہی ہوگی شاید اس کا فون کوئی نہیں اٹھاتا ہوگا اور وہ اس غم میں جان دے بیٹھی ہوگی۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اب کرسمس کا ڈھیروں ڈھیر سامان سجاوٹ، کرسمس ٹری اصلی اور نقلی دونوں سے سٹورز اور مالز بھرے پڑے ہیں نقلی ٹری سٹور کے اندر اور اصلی سٹور کے باہر۔ اب کرسمس ٹری لوگ اپنے گھروں میں لے جائیں گے۔ سارا سال گھر والوں کو جو گفٹ ملیں گے یا وہ ایک دوسرے کو دیں گے وہ کرسمس ٹری پر سجاتے رہیں گے۔ کرسمس ٹری سٹوروں کے اندر بھی مختلف چیزوں سے سجائے گئے تھے۔ ہرن، کھانا کھانے اور بنانے کے قسم قسم کے برتن اور یہ برتن Thanks Giving کے برتنوں سے مختلف ہیں اب لباس بھی مختلف ہیں، جوتے بھی اور ڈیزائن کے یہاں تک کہ چائے اور کافی کے برتن بھی فرق ڈیزائن کے ہیں۔ دنیا دیکھتے رہو اور حیران ہوتے رہو کہ کیا اہل دنیا کے دماغ پر پردے پڑ گئے ہیں کہ کل کا سامان آج بے کار ہو گیا اب سینکڑوں ڈالر لا کر نئے برتن، کپڑے، جوتے حتیٰ کہ فرنیچر تک بدل جائے گا۔

اسی فضول خرچی کا نتیجہ ہے کہ امریکیوں کی اکثریت کرائے کے فلیٹوں میں رہتی ہے اور وہ مسلمانوں سے جلتے ہیں کہ یہ غیر مما لک سے آنے کے باوجود کچھ عرصے میں اپنے مکان بنا لیتے ہیں۔ بائے نیچر میرے خیال میں مغربی معاشرہ فضول خرچ ہے۔ شراب نوشی اور دوسری غلط عادتوں کی وجہ سے قرض دار اور بدحال نظر آتا ہے۔ امین ایک جوڑے کا بتا رہا تھا کہ انہوں نے مکان کا کرایہ مقررہ مدت تک ادا نہ کیا تو امین نے کہا اب مکان چھوڑ دو کیونکہ کمپنی کا اصول یہی ہے۔ وہ سخت گھبرائے اور منتیں کرنے لگے تو امین نے انہیں کہا دیکھو تمہارے پاس نئی کار ہے (امریکی ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ کار نہایت قیمتی ہو) اس کو بیچ کر کر کوئی مناسب قیمت کی کار خرید لو اور کمپنی کے

واجبات ادا کرو اور یہاں رہتے رہو۔ انہوں نے اسی مشورہ پر عمل کیا اور امین سے کہنے لگے کہ تم کتنے اچھے ہو مجھے یہ مشورہ دیا۔ حالانکہ پہلے تم مجھے نکال رہے تھے۔ امین نے کہا وہ قانون تھا اور یہ انسانیت ہے۔ کرائے کے متعلق وہاں بہت سخت اصول ہیں اگر مقررہ تاریخ سے تم ایک دن بعد کرایہ دو گے تو پچاس ڈالر فالتو ساتھ ہوں گے۔

بات ہو رہی تھی کرسمس کی۔ گھر باہر سے سج رہے ہیں راتوں کو قمقمے روشن ہیں۔ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کا مجسمہ درمیان میں ہے ایک طرف حضرت مریمؑ نیلے اسکارف میں موجود ہیں دوسری طرف نعوذ باللہ شاید یوسف نجار ہوگا جو گلابی رنگ کی چادر اوڑھے کھڑا ہے۔ کرسمس کا اہم جز سانتا کلاز ہے۔ سٹور میں سانتا کلاز کے بت ہیں سجی ہوئی بگھی، چمکتے ہوئے ہرن، کرسمس سے پہلے ماں باپ بچوں سے کہتے ہیں کہ اچھے بن جاؤ ہمیں تنگ نہ کرو تو سانتا کلاز تمہیں تمہاری پسند کا تحفہ دے گا۔

سانتا کلاز کے متعلق بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ کرسمس کی رات کو وہ ہرنوں والی بگھی پر تحفے سجا کر آتش دان کے راستے سے گھر میں داخل ہوگا اور بچوں کو ان کی پسند کے تحفے دے جائے گا۔ اور پھر رات کو ہی آتش دان کے پاس گاجریں گرا دی جائیں گی کہ ہرن کھائیں گے۔ سانتا کلاز بھی ایک متنازع شخصیت ہے۔ عیسائی کہتے ہیں یہ ہمارا ہے اور ترک کہتے ہیں یہ ترک تھا۔ اسے بچوں سے بہت محبت تھی اور وہ بچوں کو تحفے دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد Lover day یعنی ویلنٹائن ڈے آئے گا۔ جس کے متعلق نئی نسل مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ پھر ایسٹر ہے یہ بھی عجیب تہوار ہے اسکو گڈ فرائی ڈے بھی کہتے ہیں۔ سارا خاندان اکٹھا کھانا کھاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنا آخری کھانا حواریوں کے ساتھ کھایا تھا۔ اس کا اہم جز انڈے ہیں۔ بھیڑ، بکریاں، مریمؑ چھوٹا بچہ اٹھائے ہوئے۔ پہلے یہ انڈے اصلی ہوتے تھے لوگ ان پر مختلف رنگ کر کے پودوں میں چھپا دیتے تھے اور صبح کو بچے پودوں سے ڈھونڈتے تھے اب تجارت نے ترقی کی اب ہر سائز کا مصنوعی انڈا جو کھل بھی سکتا ہے اور اس کو کھولنے پر کوئی گفٹ نکل آتا ہے۔ اب ایسٹر کے لیے بھی ہر چیز نئی ہے۔ کپڑے، جوتے، پرس، زیور، کھلونے تک۔ مدرز ڈے، فادرز ڈے، سالگرہ ان سب پر اتنی فضول خرچی ہوتی ہے کہ لوگ ان سے عاجز ہیں گالیاں دیتے ہیں کیونکہ ان اخراجات

نے ان کی کمر توڑ دی ہے مگر ایک شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں، مجبوراً سب کرنا پڑتا ہے۔اور ہم ہیں کہ ان کی طرف مارے شوق کے لپکے جارہے ہیں وہ ساری نحوستیں سمیٹنے جوان کا مقدر بن چکی ہیں۔

مدرڈے کی حقیقت بھی پڑھ لیں میری بہن کی ایک کولیگ نے کہا کہ کل مدرڈے ہے میری ماں کو یہ کارڈ دے دینا تمہارے گھر کے ساتھ وہ اولڈ ہاؤس میں رہتی ہے۔بہن نے کہامیں دے دوں گی مگر بہتر ہےتم اس سے مل لو۔تم بھی تو دورنہیں ہو۔کہتی ہے میرے پاس وقت نہیں،اس نے کونسا مجھے وقت دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عقل دےاور ہم کوان کی نقالی سے بچائے آمین۔

☆☆☆

# مَردِ حق گو

1950ء کی دہائی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ غالباً سن باون یا ترپن کے آس پاس کا ذکر ہے۔ ریاست بہاولپور کے مسلم لیگی چیف منسٹر حسن محمود کے پاس سرکاری ریسٹ ہاؤس میں محکمہ انہار کا ایک باریش ایگزیکٹو انجینئر (x.e.n) کچھ فائلیں لیے کھڑا تھا۔ چیف منسٹر صاحب کے پاس اس افسر کے خلاف اطلاعات پہنچائی گئی تھیں کہ یہ جماعت اسلامی سے منسلک ہے۔ انہوں نے اس افسر سے براہ راست کرخت سے لہجے میں پوچھا:

''آپ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے؟''

''جی ہاں۔'' افسر نے ٹکا سا جواب دیا۔

غالباً چیف منسٹر صاحب کا خیال تھا کہ حکومتی کارندہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے تعلق کو چھپانے کی کوشش کرے گا اور جب وہ آئیں بائیں شائیں ہانک رہا ہوگا تو وہ اس کے خلاف موجود رپورٹس اس کے سامنے پٹخ کر اس پہ چڑھ دوڑیں گے۔ لیکن خلافِ توقع ایسا کھرا جواب سن کر وہ کچھ دیر کے لئے بھونچکا سے ہوگئے۔ انہوں نے بدستور درشتگی کے ساتھ دوسرا سوال کیا:

''آپ وہی لوگ ہیں نا جو قادیانیوں کی طرح کتابیں لئے لئے لوگوں کو بہکاتے پھرتے ہیں؟''

''Sir! we do not ascribe to Qadiyanis.''

افسر نے انگریزی میں جواب دیا۔

چیف منسٹر چپ ہوگئے۔ پھر نرم لہجے میں بولے: ''کام میں حرج تو نہیں ہوتا؟''

''جی، بالکل نہیں۔'' افسر نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

حسن محمود صاحب کے پاس کہنے کے لئے اب مزید کچھ باقی نہ رہا تھا لہٰذا وہ خاموش ہوگئے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ اس افسر کے خلاف براہ راست کارروائی کرنے سے مسلم لیگی حکومت کی بدنامی کا خدشہ لاحق ہوسکتا ہے لہٰذا ان کے حکم کے مطابق اس وقت کی سی آئی ڈی کے ایک انسپکٹر کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ اس افسر کی نگرانی کرے اور چھ ماہ کے اندر اندر اس کے خلاف رشوت خوری کا مقدمہ قائم کرے۔ چنانچہ وہ

انسپکٹر سائے کی طرح ان کے پیچھے لگ گیا۔ لیکن چند ہی ماہ بعد اس نے حکام بالا کو جو رپورٹ پیش کی اس میں صاف صاف کہا گیا تھا۔

''جناب! میں کیسے اس شخص کے خلاف رشوت ستانی کا الزام ثابت کر سکوں گا جو کسی کے گھر سے ایک گلاس پانی پینے کا بھی روادار نہ ہو۔''

محکمہ انہار کے یہ X.E.N ناصر سلطان تھے جنہوں نے سن پچاس کی دہائی میں حکومتی کارندہ ہوتے ہوئے جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کی تھی۔ پاکستان کے ابتدائی زمانے میں بیوروکریٹس یا سرکاری افسروں کے کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کی ممانعت کے لئے باقاعدہ قانون تو نہ تھا البتہ روایات یہی تھیں کہ سرکاری افسران ازخود کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کرتے تھے۔ ناصر سلطان سن 52ء سے غالبًا سن 54ء تک جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن رہے اور اس کے بعد اس وقت رکنیت سے مستعفی ہوئے جب امیر جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سرکاری ملازمین کو جماعت اسلامی سے استعفیٰ دے دینے کا کہہ دیا۔

ناصر سلطان کا کہنا تھا کہ جب انہوں نے جماعت اسلامی کی رکنیت کے لئے درخواست دی تو سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک جماعتی دورے کے سلسلے میں بہاولپور آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ناصر سلطان کو ملاقات کے لئے بلوایا۔ اس زمانے میں مولانا مرحوم کا یہ طریقہ تھا کہ وہ رکنیت کی ہر درخواست کو ازخود جانچتے تھے اور ہر امیدوار سے رکنیت ملنے سے قبل ذاتی طور پر ملاقات ضرور کرتے تھے۔ چنانچہ اس ملاقات میں انہوں نے ناصر سلطان سے پوچھا:

''اگر جماعت اسلامی میں شمولیت کی پاداش میں تمہاری سرکاری ملازمت جاتی رہے تو ذریعہ معاش کیا ہوگا؟''

''پھر اللہ مالک ہے۔'' ناصر سلطان نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''اگر بھروسہ اللہ ہی پہ کیا ہے نا'' مولانا نے فرمایا ''تو اللہ اپنے پہ بھروسہ کرنے والوں کو کبھی نیچا نہیں دکھاتا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے رکنیت کی درخواست منظور کر لی۔

ناصر سلطان کی ساری زندگی اللہ پہ بھروسہ اور اس بھروسے کے عوض اللہ کی اپنے بندے پہ نوازشات کی داستان ہے۔ آگے چل کر ہم آپ کو ناصر سلطان کی خودنوشت ڈائری سے کچھ ایسے ایمان افروز واقعات

کے بارے میں بتائیں گے جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پہ مکمل بھروسہ اورایمان رکھنے والوں کواللہ کس طرح نوازتا ہےاور مشکل اوقات میں اپنے بندے کی کہاں کہاں سےاور کیسے مدد کرتا ہے لیکن پہلے ان کی ابتدائی زندگی اوران کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچادی جائیں تاکہ ان غیر معمولی حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے جن کی بھٹی سے گزر کر ناصر سلطان کی شخصیت وہ کندن بن سکی جس کو ہر طرح کی کسوٹیوں پر پرکھا گیا مگر وہ ہر آزمائش میں کھری نکلی۔ معاملہ مسلم لیگی چیف منسٹر حسن محمود کا ہو یا مغربی پاکستان کے سخت گیر گورنر ملک امیر محمد خان، نواب آف کالاباغ کا، ناصر سلطان نے ہر ایک کے سامنے حق بات کہنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی اوراپنے محکمہ کے افسران بالا کے دباؤ کے باوجود کسی بھی طاغوتی شخصیت کے غلط حکم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔

ناصر سلطان کا تعلق بھارت کے صوبہ اتر پردیش میں افغان روہیلوں کی بنائی ایک ریاست روہیل کھنڈ کے صدر مقام بریلی میں رہائش پذیر ایک جدی پشتی رئیس خاندان سے تھا جو 1857ء کی جنگ آزادی تک 500 موضع کے لگ بھگ جاگیر کا مالک تھا۔ اس خاندان کے اجداد محمد غوری کی افواج کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ وہ بہاولپور میں جماعت اسلامی کے اولین اراکین میں سے تھے۔ چودھری عبدالمجید صاحب ان دنوں شہر کے ایک معروف سکول میں پڑھایا کرتے تھے، وہ ناصر سلطان کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے گھر آیا کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کی تحریک سے وہ بھی متاثر تھے۔ ناصر سلطان نے جماعت کے کام کی ابتدا ان سے کی اور تجویز دی کہ کیوں نہ وہ دونوں مل کر ہفتہ وار درس قرآن ترتیب دیں۔ چنانچہ دونوں نے مل کر ہفتہ وار قرآن کا مطالعہ شروع کر دیا۔ دوافراد پہ مشتمل غالبًا یہ بہاولپور میں جماعت اسلامی کا پہلا حلقہ تھا۔

بہاولپور میں ناصر سلطان کا گھر صلہ رحمی پہ عملدرآمد کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ ان دنوں پاکستان نیا نیا بنا تھا اور ہندوستان سے لوگ مسلسل ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے۔ 1947ء کے بعد کے ماہ وسال میں آنے والے لوگ زیادہ تر اپنے رشتہ داروں اور جان پہچان والوں کے پاس ٹھہرتے تھے۔ ناصر سلطان کا گھر بھی ان دنوں دور و نزدیک کے عزیز و اقارب کے علاوہ

جان پہچان اور انجانے لوگوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔لوگ دور دراز کا سفر کر کے پاکستان آتے، بہاولپور پہنچتے،ان کے یہاں قیام کرتے اور پھر جس جس کا جہاں کہیں ٹھکانہ بنتا، وہاں کے لئے روانہ ہو جاتا۔

ان دنوں اکثر ساٹھ اور ستر ستر تک افراد بیک وقت ان کے گھر پہ موجود ہوتے اور وہ نہایت خوشی خوشی ان سب کو اپنے یہاں رہائش مہیا کرتے۔ان کا مہمانوں کے ساتھ برتاؤ محض رسم دنیا پوری کرنے کے لئے نہیں ہوتا تھا بلکہ مہمانوں کو اپنے خدا کی رحمت سمجھتے ہوئے ان کو حقیقی دلی خوشی محسوس ہوتی تھی۔جس کا احساس ان کے مہمانوں کو بھی ان کی تکلف سے عاری بول چال، رکھ رکھاؤ اور طور طریقے سے ہو جاتا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ٹھہرنے والوں نے بھی کبھی خود کو ان پہ بار محسوس نہیں کیا۔

پاکستان آنے کے بعد سب سے پہلے انہوں نے اپنے چچازاد بھائی بہنوں کو اپنے پاس بلوایا۔ان کے ایک چچا کا بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا تھا۔اپنے اس چچا کے کنبہ سے ان کو دلی لگاؤ تھا، خاص طور پہ ان کی اس بچی سے جو باپ کے انتقال کے چھ ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔اپنی اس ننھی سی بہن کو انہوں نے ہمیشہ اپنے قریب رکھا اور اپنی اولاد کی طرح اس کی پرورش میں حصہ لیا۔اپنے ان مرحوم چچا کے مختصر سے کنبہ کو انہوں نے سب سے پہلے پاکستان بلوایا اور اپنی چچی کو ان کے دونوں بچوں سمیت اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ان کی یہ بہن مریم ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں۔اگر وہ کبھی دوروں پہ گھر والوں کو ساتھ لے کر جاتے تو اس بہن کو ضرور ساتھ لے کر جاتے۔اس کے ساتھ خاندانی امور سے لے کر سماجی اور معاشرتی مسئلے مسائل، ملکی اور غیر ملکی غرض ہر امر پہ گفتگو اور بحث و مباحثہ کرتے۔جماعت اسلامی کا لٹریچر ان کو پڑھنے کو دیتے اور پھر اس پہ تبصرہ و تنقید کی جاتی۔عورت ہونے کے ناطے اسلامی امور سے متعلق ان کے ذہن میں جو جو سوالات اٹھتے ان پر یہ بحث کر کے، تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کرتے، نتیجتاً ان کی اس ہونہار بہن کا ذہن بھی بچپن سے ہی تحریکی ہونا شروع ہو گیا تھا۔خاندان کے بڑے جب بیٹھ کر ملکی حالات یا کسی عالمی مسئلے پہ آپس میں بحث و تمحیص کر رہے ہوتے تو وہ ان کے درمیان بیٹھ کر خاموشی سے ان کی باتیں سنتیں، بڑے ہوتے ہوتے وہ گفتگو میں شریک بھی ہونے لگیں۔پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کو لکھنے لکھانے کا بھی شوق ہو گیا۔شاعری بھی شروع

کردی اور اپنا تخلص "بینا" کہتیں۔ اور جلد ہی جماعت اسلامی کی تحریک سے متاثر خواتین کے حلقے میں نمایاں ہونے لگیں اور بنتِ مجتبیٰ "بینا" کے نام سے معروف ہوئیں۔ ناصر سلطان قدم قدم پہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور جب شادی کے بعد ان کے شوہر کی جانب سے بھی یہ حوصلہ افزائی جاری رہی تو وہ نور اور بتول جیسے رسالوں کی ادارت کرنے کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کی حلقہ خواتین کی بھی سرگرم رکن بن گئیں۔ جماعت اسلامی کی جانب سے لاہور میں کونسلر بھی منتخب ہوئیں اور پوری زندگی اسلامی تحریک کو جاری وساری رکھنے میں صرف کردی۔ یہ عجیب بات ہے کہ بریلی میں پیدا ہونے والی اس خاتون نے اپنی ساری زندگی تحریکی کام کیلئے پاکستان میں گزاری، لیکن ان کی مٹی انکو کھینچ کر دبئی لے گئی جہاں وہ اب آسودۂ خاک ہیں۔

1952ء میں ناصر سلطان کا تبادلہ بحثیت ایکس ای این بہاولنگر ہوگیا۔ سید مودودی کے اس فیصلے کے بعد کہ سرکاری ملازمین جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیں۔ انہوں نے جماعت اسلامی کی رکنیت چھوڑ دی، لیکن جماعت اسلامی کے اصلاحی اور تربیتی نظم میں شمولیت باقی رکھی۔ گاہے گاہے جماعت کے سیاسی جلسوں میں بھی جاتے رہے۔ اگر کبھی لاہور جانا ہوتا تو حسب توقع مودودی صاحب کے درس قرآن یا ان کی بعد نماز عصر ملاقاتیوں کے لئے لگنے والی محفلوں میں ضرور شرکت کرتے۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ C.I.D مودودی صاحب کے پیچھے سائے کی طرح لگی رہتی تھی اور ہر آنے جانے والے پہ نظر رکھتی تھی لیکن ان کے جماعت اسلامی کے تعلق کی اطلاع کے لئے کسی سی آئی ڈی رپورٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی کسی رپورٹ کے بنا ہی ان کے جماعت سے تعلق کا علم حکام بالا کو ہر ہر سطح پہ، ان کے ہم منصب افسران کو اور ان کے تمام ماتحتوں کو تھا، انہوں نے خود کبھی جماعت سے تعلق کو نہ چھپایا نہ کسی کو پوچھنے پہ انکار کیا۔ یہ غالبًا اللہ کا کرم ہی تھا کہ اس زمانے میں اور بعد کے زمانوں میں بھی باوجود اس حقیقت کے کہ جماعت اور اس سے تعلق رکھنے والے افراد حکومتوں کے زیر عتاب رہے، کسی نے کبھی بھول کر بھی ان کے سرکاری اہلکار ہوتے ہوئے جماعت اسلامی کی کارروائیوں میں دلچسپی لیتے رہنے پہ ان سے کوئی مواخذہ نہیں کیا۔

بہاولنگر میں ان کی مقبولیت تیزی سے کسانوں اور کاشتکاروں میں پھیلتی گئی اور ساڑھے چار، پانچ سال بعد جب انکی ترقی ہوئی اور وہ بحثیت ایس ای (SE) قلات، بلوچستان، کے لئے روانہ ہوئے تو ریلوے اسٹیشن پہ ان کو خداحافظ کہنے والوں کا ایک ہجوم اُمڈ آیا تھا۔ قلات اور مستونگ میں ڈیڑھ دو سال گزارنے کے بعد جب ان کا تبادلہ میانوالی میں ہوا تو ایوب خان کا دورِ حکومت جڑ پکڑ چکا تھا۔ نواب کالاباغ ملک امیر محمد خان کو مغربی پاکستان کا گورنر بنا دیا گیا۔ امیر محمد خان کی سخت گیر طبیعت کی داستانیں تیزی سے افواہوں کی شکل میں پھیل رہی تھیں۔ حکومتی بیوروکریسی پہ ان کی سخت گرفت سرکاری کارندوں کو ہر وہ کام کرنے پہ مجبور کر رہی تھی جس کا حکم گورنر ہاؤس سے آئے یا ان کے نام لے کر کروانے کا کہا جائے۔ امیر محمد خان کا اتنی بڑی بیوروکریسی کو اتنی کامیابی سے اپنی گرفت میں رکھ سکنے کا راز شائد اس بات میں پنہاں تھا کہ وہ ماتحت سرکاری مشینری پہ کڑی نظر رکھتا تھا۔ اور تمام اہم محکموں کے کم وبیش ساٹھ فیصد افسران کو وہ نام بنام جانتا اور پہچانتا تھا۔ کسی بڑے سے بڑے طرم خان کمشنر یا سیکرٹری، آئی جی یا ایس پی، کلکٹر یا چیف انجینئر میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس کے حکم کے آگے چوں بھی کر سکے۔

ناصر سلطان جب میانوالی پہنچے تو تھل کے ایک وسیع و عریض علاقے کی آبپاشی ان کی زیرِنگرانی آ گئی۔ داؤدخیل کے نزدیک کالاباغ کے جناح ہیڈ ورکس سے لیکر بھکر، لیہ اور کوٹ ادو تک کے علاقوں کو قابل کاشت بنانے اور جہاں جہاں ممکن ہو ریگستان میں پانی پہنچا کر زراعت کو فروغ دینے کا کام انہوں نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا جس کی تکمیل کے لئے ان کو علاقے کے لمبے لمبے دورے کرنا پڑتے تھے۔ میانوالی پہنچ کر ابتدائی دنوں میں وہ ایک ایسے ہی دورے پر تھے جب ایک علاقے کے لوگوں نے اپنے سیاسی لیڈر اور بڑے زمیندار کی قیادت میں ان کی گاڑی کا گھیراؤ کیا۔ مسئلہ ان کے علاقے میں زمینوں تک پانی پہچانے کا تھا جو ایک چھوٹی سی نہری راجباہ کے ہوتے ہوئے بھی ان کو اس لیے نہیں مل رہا تھا کہ نہر سرکنڈوں اور بھرے کی جھاڑیوں سے پٹی پڑی تھی اور پانی کا بہاؤ بالکل رک گیا تھا۔ ملک صاحب جو ان لوگوں کی قیادت کر رہے تھے بضد تھے کہ ان کا مسئلہ وہیں اور اسی وقت حل کیا جائے۔ ناصر سلطان کا کہنا تھا کہ وہ وہاں اس حالت میں کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر ان کو جانے دیا جائے تو وہ وعدہ

کرتے ہیں کہ پہلی فرصت میں باقاعدہ پلاننگ کر کے اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔

''جی ، یہ وعدہ ہر افسر کر کے گیا ہے۔ کسی نے دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا، اور ہم جانتے ہیں کہ اب بھی اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلے گا۔'' ملک صاحب جل کر بولے۔

''تو پھر تو میں بھی یہاں کھڑا ہوں اور آپ بھی یہیں کھڑے رہیں، اور ہم دعا کرتے ہیں کہ کسی طرح یہ مسئلہ کھڑے کھڑے حل ہو جائے۔'' ناصر سلطان نے جواباً کہا تھا اور گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

ملک صاحب اور ان کے ساتھ آئے ہوئے لوگ کچھ دیر مزید گاڑی کا گھراؤ کیے کھڑے رہے۔ پھر شاید انہیں احساس ہوا کہ واقعی اس طرح گھیراؤ میں کھڑے رہنے سے یہ افسر بھی کچھ نہیں کر سکے گا، لہٰذا وہ ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے اور ناصر سلطان واپس دفتر آ گئے۔ ان سے قبل محکمہ انہار کے افسران اس نہر کی بحالی کے لئے کام کرنے میں صرف اس لیے ہچکچا رہے تھے کہ جو مسئلہ درپیش تھا اس کا کوئی آسان حل نہ تھا نہر میں پانی کا بہاؤ صرف اسی صورت میں بحال ہو سکتا تھا جب اس میں اگے ہوئے سرکنڈے اور بھرے کو کاٹ کر صاف کر دیا جائے۔ مگر بھرے کی جھاڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ لاکھ کاٹو اس کی جڑ پھر بھی زمین میں رہ جاتی ہے اور پانی کی موجودگی میں کچھ ہی دنوں میں پھر سر نکال لیتی ہیں۔ چنانچہ مسئلہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ ناصر سلطان بتاتے تھے کہ واپس پہنچ کر انہوں نے نہر کی صفائی کا باقاعدہ ایک پراجیکٹ تشکیل دیا، اپنے لئے مخصوص بجٹ میں سے ایک خاص رقم اس پراجیکٹ کے لئے وقف کی اور پھر محض اللہ پہ بھروسہ کر کے نہر سے سرکنڈوں کی کٹائی کا کام شروع کروا دیا، ایک آدھ ماہ میں ہی نہر ہیڈ سے ٹیل تک ہر قسم کی جھاڑیوں سے صاف ہو گئی، چنانچہ اس میں پانی چھوڑ دیا گیا۔ پھر کرنا خدا کا کچھ یوں ہوا کہ زرخیز مٹی میں دبی، وافر پانی کی موجودگی کے باوجود سرکنڈے اور بھرے کی جڑوں سے جھاڑیاں دوبارہ نہ پھوٹ سکیں اور وہ نہر اس دن سے آج تک روانی سے بہہ رہی ہے۔ اس کے دونوں جانب آباد ہونے والی زمین اور خلق خدا کی آبادیاں وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئیں اور کبھی صحرا کا حصہ بنا وہ علاقہ اب ہری بھری کھیتیوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ناصر سلطان ہمیشہ اپنے سامعین کی توجہ اس قرآنی بیان کی طرف ضرور مبذول

کراتے تھے جس کا مفہوم ہے ''ہاتھ ہے اللہ کا بندہ ٔمومن کا ہاتھ۔''

بہت عرصے بعد ایک دن وہی ملک صاحب اتفاقاً کسی کام کے سلسلے میں ناصر سلطان سے ملنے ان کے دفتر پہنچے، چائے کی پیالی سامنے رکھے ملک صاحب بھول چکے تھے کہ سال ڈیڑھ سال قبل انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے افسر کا کس طرح استقبال کیا تھا۔ باتوں باتوں میں ناصر سلطان نے ملک صاحب سے پوچھا ''ملک صاحب! آپ کو یاد ہے کہ جب میں نیا نیا یہاں آیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ میں بھی دوسرے افسران کی طرح آپ کی نہر کی صفائی میں کوئی دلچسپی نہیں لونگا اور نہر بدستور بند رہے گی۔ اب آپ کی وہ نہر کیسی ہے؟''

ملک صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلنے والا جملہ تھا۔ ''مجھے اس وقت بھلا کیا معلوم تھا کہ ہمارے یہاں ایک مسلمان آ گیا ہے۔''

ناصر سلطان کہا کرتے تھے کہ ان کے منہ سے یہ سن کر انہیں بے انتہا خوشی ہوئی تھی یہ وہ دوسری خوشی تھی جس کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ ایسی خوشی انہیں کبھی نہیں ملی۔ اس خوشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہوں نے بدگمانی رکھنے والے ملک صاحب کی بات کو غلط ثابت کر دکھایا تھا یا یہ کہ وہ وہی شخص جوان سے بدگمان تھا اب یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ جو کام دوسرے لوگ نہیں کر سکے تھے وہ انہوں کر دکھایا۔ بلکہ ان کی خوشی کی اصل وجہ وہ گواہی تھی جو انہیں ایک ایسے شخص سے ملی تھی جس کو ان سے نہ کسی قسم کی کوئی طمع تھی نہ توقع۔ اس گواہی کی بے ساختگی کہنے والے کے چہرے سے عیاں تھی جس کو ناصر سلطان نے محسوس کیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک ایسی گواہی تھی جس کو وہ اپنے رب کے سامنے پیش کر کے آخرت میں اپنی نجات کی کوشش کر سکیں گے۔

ناصر سلطان کے ایک دیرینہ دوست چوہدری عبدالمجید صاحب نے ایک واقعہ ان سے متعلق سنایا تھا وہ واقعہ سن کر احساس ہوتا ہے کہ انسان کی لوگوں کے لئے کی گئی نیکیاں کس طرح اس کو وہ اخلاقی قوت فراہم کرتی ہیں جو بڑی متضاد اور متصادم قوت پہ حاوی ہوجاتی ہیں۔ یہ غالباً 77ء کے انتخابات کا زمانہ تھا، چوہدری عبدالمجید صاحب کا کہنا تھا:

''ہم چند ساتھی جماعت کی انتخابی مہم کے سلسلے میں بہاولپور کے ایک نواحی گاؤں میں گئے۔ گاؤں کی مسجد میں پڑاؤ ڈالا اور طے یہ ہوا کہ عصر کے بعد امام

صاحب کے تعاون سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ اعلان کروایا جائے گا تا کہ گاؤں کے لوگ ہماری بات سن سکیں اور جو بات جماعت لوگوں کو سمجھانا چاہ رہی ہے وہ لوگوں تک پہنچ سکے۔

مشورہ ہو رہا تھا کہ امام صاحب جو غالباً جماعت اسلامی کی سوچ سے متفق نہیں تھے بھانپ گئے اور لاؤڈ اسپیکر پہ یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ یہ حضرات جو یہاں آئے ہیں بہکے ہوئے گمراہ لوگ ہیں۔کوئی بھی ان کے پاس نہ جائے اور نہ ہی ان کی کوئی بات سنے۔

ہم سب کے لیے یہ اچانک تھا اور مایوس کن بھی۔ خیر، ہم اللہ کے بھروسے وہاں بیٹھے رہے اور امام صاحب کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کرنے لگے جو بے سود رہی۔اتنے میں ایک صاحب مسجد میں داخل ہوئے اور ناصر صاحب کو دیکھ کر تپاک سے مصافحہ کیا اور حال چال دریافت کرنے لگے۔ان کی گرم جوشی غیر معمولی تھی مگر ناصر سلطان صاحب کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ان صاحب کو پہچان نہیں پا رہے اور از راہ مروت ان کی باتوں کا جواب دیئے جا رہے ہیں۔ میں یہ سب تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ اتنے میں ان صاحب نے ناصر سلطان سے آنے کا مقصد دریافت کیا جو انہوں نے بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ امام صاحب تو ہمیں سننا بھی گوارا نہیں کر رہے جبکہ ہم تو سب کی بھلائی کے لئے ہی یہاں آئے ہیں۔

وہ صاحب جو حلیہ سے زمیندار لگتے تھے اور اس گاؤں میں شاید ان کا اچھا اثر و رسوخ تھا ایک دم امام صاحب پاس کے گئے اور ان سے کہا یہ بہت اچھے لوگ ہیں،آپ انہیں سنیں بھی اور لاؤڈ سپیکر بھی استعمال کرنے دیں۔ پھر وہ خود لاؤڈ اسپیکر پہ گئے اور اعلان کیا کہ یہ لوگ جو گاؤں میں آئے ہیں میں خود ان کو جانتا ہوں۔ یہ بہت اچھے اور نیک لوگ ہیں،آپ سب آ کر انہیں ضرور سنیں۔ میں اور ہمارے دیگر ساتھی یہ سب ماجرہ دیکھ رہے تھے اور محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ہم سے جب رہا نہ گیا تو ہم نے ان صاحب سے پوچھا کہ آخر آپ ناصر سلطان کو کیسے جانتے ہیں اور یہ کہ یہ سب آپ کیوں کر رہے ہیں؟

وہ صاحب گویا ہوئے: یہ کچھ سال پہلے کی بات ہے، میری زمینداری ہے اور میرا پانی سے متعلق ایک پرانا مسئلہ چلا آ رہا تھا۔ جب ناصر سلطان اس دفتر میں آئے تو میں مسئلے سے متعلق ایک درخواست لے کر ان

کے پاس بھی چلا گیا۔ انہوں نے میری فائل نکلوائی اوراسے پڑھا۔ میرامسئلہ حقیقی تھا۔ ان سے پہلے کے افسران اپنے ماتحتوں سے پوچھ کر فیصلے کرتے تھے اور میری کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ ناصرصاحب نے کہا کہ مسئلہ کے حل میں کچھ وقت لگے گا۔ میں نے کہا: جی ،بہت اچھا۔ پھرخود ہی کہنے لگے'' مگراس وقت تک تو آپ کی فصل کا بہت نقصان ہوجائیگا۔'' میں نے کہا'' جی ہوگا تو۔مگرمیں برداشت کرلوں گا۔کم ازکم اگلی فصل کے لئے تو میرا مسئلہ حل ہوجائے گا۔'' میری حامی بھرنے کے باوجود ناصر صاحب میرا نقصان ہوجانے کے لئے تیار نہ تھے اور کہنے لگے کہ'' آپ کا نقصان نہیں ہونا چاہیے۔'' میرے مسئلہ کو وقتی طور پہ حل کرنے کے لئے ایک پلان مرتب کرکے اپنی ذاتی ذمہ داری پر اس پر عملدرآمد کے احکامات صادر کردئے۔ ساتھ ہی مستقل حل کے احکامات بھی دے دیئے۔ میرے لیے تو یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔اول تو افسرحضرات ملنے کے لئے وقت ہی نہیں دیتے تھے۔اوراگرکوئی مل بھی لے تو مسئلہ کو سمجھ کرحل نکالنے پرراضی نہ ہوتا۔ادھر یہ عالم کہ سائل کا نقصان دیکھنے کو تیارنہیں۔اب آپ ہی کہیے،ایسا انسان اگرہمارے درمیان آئے تو وہ کیا کوئی غلط کام لے کرآئے گا۔

بظاہر تو جماعت اسلامی انتخابات ہارگئی مگر نیک نامی نہ ہاری۔

لوگوں کے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ کسی عام وزیر، سفیریا گورنر کی سفارش بربنائے عہدہ ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کے جماعت اسلامی سے تعلق اور جماعت اسلامی کی فکری تحریک سے متاثر لوگوں سے التفات کا علم بھی لوگوں کو تھا۔چنانچہ ایک صاحب اپنے کسی کام کے لئے سیدابوالاعلی مودودیؒ کا اپنے ہاتھ سے تحریرشدہ درج ذیل خط ان کے پاس لے آئے۔

بخدمت گرامی جناب ناصرسلطان صاحب

مکرمی ومحترمی السلام علیکم ورحمتہ اللہ

حامل ہذا نوابزادہ نصراللہ خان صاحب کا خط لے کرمیرے پاس آئے ہیں۔اورکوئی پانی کا مسئلہ آپ سے متعلق ہے جس میں آپ ان کے خلاف فیصلہ کرچکے ہیں۔ مجھے اگرچہ اطمینان ہے کہ آپ ہمیشہ حق وانصاف کو اپنے فیصلوں میں ملحوظ رکھتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ آپ کو اس مسئلہ میں غلط فہمی ہوئی ہے اس

لیے یہ سطور تحریر کررہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ دوبارہ ان کی بات توجہ سے سن کر اگر انصاف کے مطابق کوئی گنجائش پائیں تو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

والسلام خاکسار

ابوالاعلیٰ

اب یہ تو معلوم نہیں کہ ان صاحب کا کام ہو سکا یا نہیں، لیکن ناصر سلطان نے سید مودودی کے اس خط کو بہت سنبھال کر رکھا تھا اور از راہ تفنن کہتے ہیں کہ یہ خط میں اپنے کفن میں رکھواؤنگا تاکہ یوم حشر اس کو گواہی کے طور پر پیش کر سکوں۔

لائیلپور سے ان کا تبادلہ بہاولپور کا ہوا اور نوکری سے ان کی ریٹائرمنٹ اس ہی شہر میں ہوئی جہاں پاکستان آ کر انہوں نے نوکری شروع کی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ایک مرتبہ پھر جماعت اسلامی کی رکنیت حاصل کرلی۔ امیر جماعت اسلامی بہاولپور رہے۔ بڑھتی عمر کے تقاضے کی وجہ سے ایک دن اس ذمہ داری سے بھی علیحدگی اختیار کی۔ لیکن جماعت اسلامی کی سرگرمیوں اور کارروائیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔ تقریباً آخر عمر تک جماعت کے تعاون سے بننے والی دو مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر میں عملی حصہ لیتے رہے۔

آخری ایام میں ان کی دعا یہ بھی ہوتی تھی کہ جب اللہ کی طرف سے بلاوا آئے تو اللہ ان کو تین دن کی مہلت دے جس میں ان کے عزیز و اقارب جمع ہو سکیں اور ان کی مغفرت کے لئے دعا کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے آخر عمر تک ان کو کسی کا محتاج نہیں کیا تھا۔ چلتے پھرتے تھے، گھر کے قریب بنی مسجد تک نماز ادا کرنے جاتے تھے۔ ایک رات تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے کہ فالج کا حملہ ہوا اور نماز کی چوکی سے نیچے گر پڑے۔ انکو ہسپتال لے جایا گیا جہاں کچھ دیر بعد وہ کومہ میں چلے گئے اور ٹھیک تین دن بعد 20 دسمبر 1992ء کو فجر کی اذان کے فوراً بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ان تین دنوں میں ان کے عزیز و اقارب جمع ہو چکے تھے۔ اسی دن عصر کے بعد گھر سے ملحقہ قبرستان میں تدفین ہوگئی۔ ہزار کے لگ بھگ لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ بہاولپور کے اطراف اور دوسرے شہروں سے لوگ طویل عرصہ تک تعزیت کے لئے ان کے گھر آتے رہے۔

ناصر سلطان دنیا سے چلے گئے۔ اپنے پیچھے حق

گوئی اور جرأت کی بہت سی داستانیں چھوڑ گئے۔ زندگی کے آخری ایام میں انہیں بازار میں ایک بھیک مانگتا فقیر ملا تھا۔ اسے گھر لائے اور کہا کہ وہ ہر روز شام کو کھانا ان کے یہاں سے آکر کھالیا کرے۔ لیکن بھیک مانگنا چھوڑ دے۔ فقیر باقاعدگی سے ہر شام گھر آتا رہا، کبھی کبھی کچھ دنوں کے لئے غائب بھی ہو جاتا لیکن پھر آنے لگتا۔ ایک شام اس کے آگے کھانا رکھا گیا اور بتایا گیا کہ اس کا محسن اب دنیا میں نہیں، وہ ان کے لئے دعا کرے۔ فقیر کھانے کو ہاتھ لگائے بغیر کھڑا ہو گیا۔ بابا آنسو بہاتا گھر سے روانہ ہو گیا اور دوبارہ کبھی نظر نہ آیا۔

☆☆☆

# محشر خیال

## خورشید بیگم۔ گوجرہ

الحمدللہ اس ماہ تو ماہنامہ بتول 4 تاریخ کو مل گیا۔ خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ ''ابتدا تیرے نام سے'' کتنا پیارا ہے یہ جملہ بہن صائمہ اسما کا ''دلوں کے دریچوں پر بھی بہاریں دستک دیا کرتی ہیں اور انہیں بند پا کر لوٹ جاتی ہیں۔'' اللہ کرے ہمارے دلوں کے دریچے بہاروں کے استقبال کے لئے وا رہیں۔ (آمین) محترمہ نصرت محمود نے درود شریف کا اتنا وسیع مفہوم ہم تک پہنچایا ہے کاش عاشقان رسولؐ کی سمجھ میں آجائے۔ قول نبیؐ میں محمد سلیم جیلانی نے والدین کی زندگی میں ان کی خدمت کی سعادت سے محروم رہنے والی اولاد کو راہِ عمل دکھائی ہے۔ پچھتانے کی ضرورت نہیں رب رحیم تو اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے۔

خوب لائحہ عمل وضع کیا بہن قانتہ رابعہ نے محمد طاہر زمان اور اس کی طرح کے دوسرے نوجوانوں کیلئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ امجد، شہزاد، فاروق وغیرہ کی درستگی کے لئے کوئی اور لائحہ عمل سوچنا پڑے گا کیونکہ وہ تو پختہ عادات کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر شگفتہ نقوی صاحبہ نے ہلکے پھلکے انداز میں موبائل کی تباہ کاریاں بیان کر دی ہیں۔ واقعی یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کے لئے کافی ہے۔ (کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا) ''رشو کی نانی'' اچھا لگا، سب بیٹیوں کی مائیں رشو کی نانی کی طرح سوچنے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ ہمارا معاشرہ پاکیزہ اور پرسکون ہو جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میری امی جان نے پانچ بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ جب دولہا کو گھر میں لا کر بٹھایا جاتا تو صرف خاندان کی شادی شدہ خواتین سامنے آتیں۔ سلامی دیتیں اور بس۔ کسی کو بھی جرأت نہ ہوتی کہ ان کے اس عمل پر کوئی اعتراض کرے۔ ''نمایاں خواتین کا تذکرہ'' ملکہ نور جہاں کا دنیا میں بخت بلند ہوا لیکن پھر زوال آشنا ہوا۔ اس میں سامان عبرت ہے لیکن سمجھ رکھنے والوں کے لئے۔

محترمہ آسیہ راشد صاحبہ نے ڈاکٹر شگفتہ نقوی صاحبہ سے ہماری ملاقات کروائی۔ بہت شکریہ ان کا۔

گاہے گاہے ایسے باہمت لوگوں سے ملاقات ہونی چاہیے۔''اجڑا گھر'' (شاہدہ اکرام) مالک کائنات کی نظر میں آباد ہوتا ہے کیونکہ وہ اس گھر کے مالک کے لئے جنت میں بہترین گھر بنا رہا ہوتا ہے۔منتخب کالم میں انصار عباسی نے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو تحفہ دیا ہے اسے قبول نہ کرنا بدنصیبی ہوگی۔''گوشۂ تسنیم'' محترمہ ڈاکٹر بشریٰ تسنیم صاحبہ کا شکریہ ادا کرنے کیلئے الفاظ میرے پاس نہیں۔ان کی تحریر نے دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر اسے رب العالمین کے نور سے مسحور کر دیا۔کتنی ہی نعمتیں میرے اللہ کی عطا کردہ ہیں جن کا ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا۔سب سے بڑی نعمت تو نبیِ رحمتؐ ہیں جن کے ذریعے ہمیں اسلام اور قرآن کی نعمتیں عطا ہوئیں۔ پھر کیوں نہ میرے دل کی ہر دھڑکن پکارےﷺ اللہ کرے ہر مسلمان کو یہ احساس ہو جائے آمین۔

☆☆☆

# سوشل میڈیا کا بے قابو جن گرفت میں رکھیے

اپنی ذات، اپنی فیملی کے علاوہ اپنی تقریبات، مستقبل کے منصوبے اب کچھ بھی مخفی نہیں رہا

اگر میں ناراض تھی تو بات تھی بھی ایسی ہی۔ پورا ہفتہ گزر گیا ماسی کو کہتے ہوئے کہ موبائل لیکر نہ آیا کرے۔ ادھر وہ گھر میں داخل ہوئی اور ادھر فون آ گیا۔ پورا گھنٹہ باتیں کرتی رہتی ہے۔ ایک ہاتھ سے جھاڑو دیتی ہے تو دوسرے میں موبائل۔ اور آج تو اس نے حد کر دی میرے خوف سے فون آتے ہی دوپٹے کو اس انداز سے سر پر باندھ لیا کہ موبائل ہاتھ میں پکڑنا بھی نہ پڑے وہ دوپٹہ کے ساتھ کان سے منسلک ہو گیا تو میرا غصہ بھی دوبالا ہو گیا۔ فیصلہ کر لیا میں نے کہ ماسی کو اب نکالنا ہے اور دوسری ماسی ڈھونڈوں گی۔

میں نے یہ آپ بیتی فون پر اپنی بہن کو سنائی تو وہ بولی ''خوش قسمت ہو تم کہ ماسی ایک کان سے تو تمہاری سنتی ہو گی میری ماسی تو گھر میں داخل ہوتے ہی ہینڈ فری لگا لیتی ہے، پھر میں خود ہی کہتی رہتی ہوں اور خود ہی سنتی رہتی ہوں۔ ماسی بے نیازی سے اپنا کام کر کے چلی جاتی ہے۔ ڈانٹ سننے اور گھڑی گھڑی کی ہدایتوں سے بھی بچی رہتی ہے۔ میں ذرا سخت لہجے میں بات کروں تو کہتی ہے ''مل جائے تو ڈھونڈ لو دوسری ماسی۔''

اب تک تو بچوں ہی کا رونا تھا کہ اس جدید ٹیکنالوجی نے والدین اور بچوں کے مابین فاصلے اتنے بڑھا دیئے ہیں کہ بچے گھر میں ہوتے ہوئے بھی میسر نہیں ہوتے اور اپنی دنیا میں داخل ہی نہیں ہونے دیتے۔ ان کی فراغت کا انتظار کرنا پڑتا ہے ان سے بات کرنے کے لیے۔ جب دیکھو سادھوؤں کی طرح گیان میں چلے جاتے ہیں۔ اب تو بات ماسیوں تک آ گئی کہ وہ بھی پوری میسر نہیں ہیں۔

میری پڑوسن تو بہت شکر گزار تھی لوڈ شیڈنگ کی۔ کہ اس طرح اہل خانہ کے ساتھ بیٹھنے کو کچھ وقت تو میسر آ جاتا ہے۔ اب تو فیس بک اور سوشل میڈیا نے بچوں کو اتنا مصروف کر رکھا ہے کہ وہ ایک گلوبل ویلج کا حصہ بن گئے ہیں اور پوری دنیا سے رابطہ میں ہیں ہزاروں دوستوں کو نباہ رہے ہیں لیکن گھر میں موجود بہن بھائیوں اور آنے جانے والے رشتہ داروں سے بے نیاز ہیں۔ بچے اسکول سے آتے ہیں تو فوراً لیپ

ٹاپ لے کر بیٹھ جاتے ہیں، کتنے پیغام آئے، کتنے نئے دوست بنانا ہیں، کتنے بن گئے......سوال یہ ہے کہ اتنی دوستیوں کا کرنا کیا ہے؟ اوران دوستیوں کا معیار کیسے جانچا جائے گا!!

اب تک سمجھ دار والدین بچوں کے دوستوں سے فیملی کو متعارف کرا دیتے تھے کہ علم رہے کہ بچہ کا آنا جانا کس گھر میں ہے؟ اس لیے کہ یہ ہیں محتاط معاملات ۔ کیونکہ نبی پاکؐ نے فرمایا کہ ''ہر شخص اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے ۔'' لہٰذا دوستیوں کا معاملہ اتنا ہلکا پھلکا تو نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن اب تو دوست ہزاروں میں ہیں۔اور بچے ہوا ہی نہیں لگنے دیتے اپنے پاس ورڈ کی ۔لہٰذا کیسے ان دوستیوں کا سراغ لگایا جائے۔

میرا میٹرک کا طالب علم بیٹا جب اپنا سٹیٹس اپ ڈیٹ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو سوچتی ہوں کہ اس کا ''سٹیٹس'' ہے ہی کیا جس کو اپ ڈیٹ کرنے کی فکر اسے لگی رہتی ہے۔ اب صبح سے شام تک کس نے کیا کھایا، کون کہاں گیا، کس کے دوست گھر آئے، سب کچھ تصویری شکل میں شیئر ہوتا رہتا ہے۔ میرا بیٹا دوست کے گھر جاتا ہے۔ سب دوست اکٹھے ہوتے ہیں اوراس کے گھر آنے سے پہلے وہ تصاویر فیس بک کی زینت بن چکی ہوتی ہیں۔ وہ کہاں کہاں تک جاتی ہیں فیس بک کے حوالے سے یہ سراغ لگانا اب کسی کے بس کا روگ نہیں۔ ادھر دلہن ہال میں آئی اور رخصتی سے قبل اس سجی سنوری دلہن کی تصاویر فیس بک کے ذریعے نہ معلوم کہاں کہاں شیئر ہو گئیں؟

اس وقت فیس بک استعمال کرنے والے لاکھوں نہیں کروڑوں میں ہیں۔ اورخطرناک ترین بات یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی معلومت کو شیئر کرتے ہیں۔ بچے بچے کا اکاؤنٹ فیس بک پر موجود ہے۔ اورمعصوم بچے یہ جانتے ہی نہیں کہ وہ خود کو اپ ڈیٹ رکھنے کے چکر میں کبھی کبھی جرائم پیشہ گروہ کی زد میں بھی آ جاتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب کوئی چیز مخفی رہی ہی نہیں۔ وہ گھر جس کے دروازے پر چوکیدار ہے اور ڈرائنگ روم میں موٹے موٹے پردے لٹکے ہوئے ہیں جہاں بہنیں بھائی کے دوستوں کو چائے پیش نہیں کر سکتیں اورجوان بیٹی باپ کے دوستوں کے سامنے بھی نہیں جاتی۔ جہاں شادی کے سلسلے میں لڑکی کو دکھانا بھی بے حجابی گردانا جاتا ہے اب وہاں گھر کی بہو، بیٹیاں سب فیس بک کی زینت ہیں۔ باپ اور بھائی کے دوستوں سے بہت آگے بات جا چکی ہے۔ اب وہ تقریبات میں

ہرطرح بنی سنوری ایک فوٹو کے بعد فیس بک کی زینت بنادی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اقدار میں شامل ہوتا چلا جارہاہے۔ آپ تقریبات میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو دیکھیں وہ تقریب کے شرکاء سے بے نیاز مسلسل موبائل سے ایک دوسرے کی تصاویر لیتے رہتے ہیں جوفوراً فیس بک کی زینت بنادی جاتی ہیں۔ یوں بھی یہ بات کہ آپ کتنے''سوشل'' ہیں آپ کا قد کاٹھ سماج میں بڑھا ہی دیتی ہے۔اورخطرناک بات یہ ہے کہ یہ بات بار بار اخباروں کی زینت بنتی ہے کہ اغوا کار جو بہت شاطراور ذہین ہیں اب اغوا کا یہ گھناؤنا کاروبار پاکستان میں انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہورہاہے۔کیونکہ اپنی ذات ، اپنی فیملی کے علاوہ اپنی تقریبات، مستقبل کے منصوبے اب کچھ بھی مخفی نہیں رہا۔ کون کہاں ہے؟ کیا کررہاہے؟ اورکیا کرنے جارہاہے؟ یہ ہمہ وقت دوستوں کے ساتھ شیئر کیا جاتاہے۔ جو بسا اوقات بہت خطرناک ثابت ہوجاتاہے۔

یہ کیسی انہونی بات ہے کہ ہمارے گھر میں تو کوئی اجنبی داخل ہونا چاہے تو ہم ہرگز اپنے گھر کا ڈرائنگ روم اسے پیش نہیں کریں گے۔ بلکہ اجنبی راستہ چلتے ہوئے سلام بھی کرے تو ہم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں۔ تقریبات میں نظرآنے والے ناشناسا لوگوں سے ہم مسکرا کر ملنا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ہم ہرایک کو نہ اپنا سمجھتے ہیں نہ اس پر اعتبار کرتے ہیں لیکن سوشل میڈیا پر ہر عمر کے لوگ ایک دوسرے کو آفر کرتے ہیں اورایک کلک کے ذریعے آپ آفر قبول کر کے بے جانے بوجھے اسکو حلقہ احباب میں داخل کر کے اس پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ سماج میں یہ کتنا بڑا فتنہ پیدا ہوچکا ہے جس کے اثرات آہستہ آہستہ ظاہر ہورہے ہیں۔اور وہ اتنے خطرناک ہیں کہ بعض اوقات سن کرلگتا ہے کہ کسی جاسوسی ناول کا کوئی موڑ ہے یا کوئی کردار کسی کرائم رپورٹر کا تحریر کردہ ہے۔

بوتل کا یہ جن جواب باہر آچکا ہے،اب اس کا اندر جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔ اس دور کے خاندانوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج یہ سوشل میڈیا ہی ہے۔ باپ گھروں سے باہر ہوتے ہیں تلاش معاش میں۔ ایک ماں کی ذمہ داری اس وقت دوچند ہوگئی ہے۔ بچوں پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی اس لیے کہ اعلیٰ تعلیم اب انٹرنیٹ کے بغیر ممکن نہیں رہی۔ اوراچھے طالب علم انٹرنیٹ علمی

استفادے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ جدید ٹیکنالوجی اب ہر گھر کی ضرورت بن چکی ہے۔

بس ضرورت حد سے زیادہ احتیاط کی ہے اپنے بچوں کو خود سے قریب رکھیں۔ ان کی حرکات وسکنات اور معمولات پر غیر معمولی نظر رکھیں۔ ساری ساری رات بچے لیپ ٹاپ کے ساتھ اگر گزارتے ہیں تو یہ خطرناک ہے۔ بچوں کو سمجھائیں اور خود بھی اگر فیس بک استعمال میں ہے تو فیس بک پر موبائل نمبر گھر کے پتے، ذاتی تصاویر اور ذاتی مصروفیات لکھتے وقت بہت محتاط رہیں۔ والدین کو بھی اس ٹیکنالوجی سے واقفیت اب وقت کی ضرورت ہے۔ گھروں کے ماحول کو دباؤ سے آزاد رکھیں تاکہ بچے ذہنی سکون کی تلاش میں ان دنیاؤں کا حصہ بننے سے گریز کریں۔ کم عمری کی شادیوں کو پھر رواج دینا ہوگا کہ یہ دجالی فتنوں کا دور ہے جب ایمان کو بچانا ہاتھ میں انگارے لینے کے مترادف ہوگا۔

اپنے خاندان کو بچانا اس وقت کی ماں کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اس وقت کی تھوڑی سے بھی غفلت کی بڑی قیمت چکانا پڑ سکتی ہے۔ رب سے لو لگائے رکھیے کہ وہ ہماری، ہمارے خاندان اور ہمارے سماج کی حفاظت فرمائے آمین۔

☆☆☆

# سودا

ملتزم میں بیٹھے بیٹھے گویا مجھ پہ صدیاں بیت گئیں۔ وقت رک سا گیا اور منظر تبدیل ہوگیا۔ سنہری جگمگاتی روشنیاں کہیں نہیں تھیں۔ بیت اللہ پر پرانا سادہ سا کپڑا تھا، کہیں سے سسکنے کی، آنسوؤں کے گرنے کی آواز آرہی تھی، خاموش فضا میں گریہ وزاری کی ہلکی سے گونج تھی۔ تھکے قدموں کی چاپ تھی اور آنکھوں سے رواں موتی نما آنسو!

''اے مکہ مجھے تجھ سے محبت ہے لیکن تیرے لوگ مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔''

وقت بہت تیز رفتاری سے گزر رہا تھا، تیزی سے تبدیل ہوتے منظر کھجوروں کے باغ، سرخ پہاڑ، لوگوں کا ہجوم، معلوم ہوتا تھا کسی کے استقبال کی تیاری ہے، اونٹ اور اس کے سوار کو پہچانتے ہی صدائیں بلند ہونے لگیں وہ آ گئے! وہ آ گئے! بدر کا چاند گویا طلوع ہوا، چہروں پر مسکراہٹیں تھیں اور آنکھوں میں آنسو! اس چاند جیسے چہرے پر خوشی کے جگمگاتے احساس تھے، مکہ سے چلتے ہوئے ان کا دل بوجھل تھا، پاؤں شل تھے مگر رب کا وعدہ تھا کہ ہم نے آپ کو اکیلا نہیں چھوڑا تو قدرِ الٰہی کے سامنے راضی برضا تھے، وہ ان کی جائے پیدائش تھی، انکے ماں باپ کا گھر! ان کے مشفق چچا اور دادا کا گھر! ان کے احباب ورفقاء کا خوبصورت ساتھ وہیں سے شروع ہوا، اسلام کے لیے پہلے شہدا کی قبریں وہیں تھیں......

وہاں کعبہ تھا! مکہ چھوڑنا آسان تو کبھی نہ تھا......

مجھے یاد آیا! مکہ چھوڑنا آسان نہیں ہے، نہ تھا اور نہ رہے!

مجھے پر ملتزم میں بیٹھے بیٹھے کئی سال گزر گئے، دور کہیں سے گھوڑوں کی چاپ اور تکبیر کا شور سنائی دیا گیا جن کو بے سروسامانی میں نکالا تھا وہ حمد کرنے اور نعرہ وحدت بلند کرتے داخل ہوئے، فاتحِ مکہ کا سر جھکا ہوا تھا! کعبۃ اللہ 360 بتوں سے پاک ہوگیا۔ اصحاب کو خوف گزرا اور چہ مگوئیاں ہوئیں مگر کچھ دیر بعد دل کو چھوتی ہوئی آواز گزری۔ ''اے انصار کے لوگو! کیا تم اس بات پہ راضی نہیں ہو کہ لوگ اپنے گھروں کو بھیڑ

بکریاں لے جاتے اور تم اللہ کے رسول کو لے جاؤ! مدینہ والوں کے ساتھ جینے مرنے کا وعدہ!'' اللہ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! آواز آئی، ''بلالؓ!'' وہ اشارہ سمجھ گئے، لپک کر کعبہ پر چڑھنے لگے اور وقت رک گیا! گویا ہوائیں ٹھہر گئیں اور سب کچھ ساکت ہو گیا!

''اللہ اکبر!'' کی گونج کون و مکاں میں تھی۔

کچھ اور سال گزر گئے، کئی سال خون میں نہا گئے۔ کچھ اور صدیاں گزر گئیں۔ وہی قصہ جفا جس نے مسلمانوں کو اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ خون سے بہتی ندیاں اور وہی ہجوم پریشاں۔ اندلس، ترکی، ہندوستان، باری باری خون میں نہا گئے۔ کئی ایک جیسے منظر تھے! اس منظر میں کئی طرح کے لوگ تھے، کئی مختلف شعلوں والے، کسی کا ہندوستانی لب ولہجہ، کسی کی عرب مشابہت، کسی کا بلال حبشیؓ سے تعلق، کوئی صہیبؓ رومی کے گھر کا رہنے والا۔ وہاں بہت گھر وہ تھے مگر ایک بات تھی! ان سب کا خون سرخ تھا، وہ بہتا ایک ہی دھارے میں تھا! سال گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دھارہ ایک ندی میں تبدیل ہو گیا ملتزم میں بیٹھے بیٹھے میں چونک گئی کیا وہاں کسی کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ حرم پاک خون وخون ہو چکا ہے، ہر طرف خون کی مہک تھی، کیا کسی کو خیال نہیں آیا کہ اپنے لمبے لمبے سجدوں سے سر اٹھا کہ دیکھے کہ کعبہ تو چاروں طرف سے خون میں نہا چکا ہے! اس کے غلاف پر سونے کی تاروں سے لکھے بادشاہوں کے نام اس امت کے خون سے دھلے ہوئے ہیں! میری آنکھوں میں آنسو آ گئے! اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی، ہر طرف پھیلی مگر یہ کیا؟ یہاں تو کئی ''انا ربکم لاعلیٰ'' کہہ رہے تھے، جنہوں نے رب کعبہ کی چادر کھینچنے کی کوشش کی اس کے کبر میں اپنا حصہ ظاہر کرنے کی کوشش کی! اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بنانے کی کوشش کی! مجھے یہ اذان کھوکھلی لگی، کیونکہ یہ تو رسمِ اذان تھی! اس میں روح بلالی تو نہ تھی۔

ملتزم میں بیٹھے بیٹھے میں نے سر اٹھا کر دیکھا سیاہ غلاف میں ملبوس کعبۃ اللہ! میرے دل سے نکلا:

''ربا! دیکھ رہا ہے نا! مجھے تو تیرے گھر سے، اس شہر سے، اپنے نبیؐ کے گھر سے محبت ہے، مگر یہاں کے لوگ مجھے رہنے نہیں دیتے!'' مجھے لگا اللہ مسکرا رہا ہے جیسے ماں کسی بچے کی بے وجہ ضد پہ مسکراتی ہے اور اس نے مسکراتے ہوئے میرے دل میں بات ڈالی، مجھے لگا جیسے وہ مالکِ دو جہاں کہہ رہا ہو، کہ یہاں سے ہجرت کرو گے تو یثرب کو مدینہ بناؤ گے! جہاں بھیج رہا ہوں وہ

یثرب والے ہیں! حق کو قبول کرنے کے لیے تیار! اس کو مدینہ بنانا مدینہ الطیبہ والے کے امتی کا کام ہے۔''

''مگر مولا! کعبے سے جدائی، حرم سے جدائی؟؟ محبت بھری آواز آئی، کیا اس بات پہ راضی نہیں ہو کہ لوگ تبرکاتِ کعبہ کو ساتھ لے جائیں اور تم کعبے والے کو؟'' یوں لگا جیسے پیاسے کو صحرا میں ٹھنڈے پانی کی جھیل نظر آ گئی ہو، برسوں سے بھٹکے کو راستہ مل گیا ہو، میں نے سلام پھیرا، ان دو رکعات میں صدیاں گزار دیں اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی، دم رخصت پیار بھری آواز آئی، ''ہاں جی! فیر چلے او؟؟؟'' (ہاں جی! پھر جا رہے ہو؟) میں نے مسکرا کر کعبے کو دیکھا، یہ وداع نہیں تھا! یہ تو شروعات تھیں...... میں نے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے، کسی نے روک کر کہا، ''یاد رکھنا! کعبہ داعی کا اصل ہوتا ہے، اور داعی اس کی طرف بار بار پلٹتا ہے۔'' داعی اعظم ﷺ کی جدوجہد کی شروعات مکہ سے ہوئی تھی، اُنؐ کی مقام لحد مدینہ الطیبہ قرار پائی۔

رخصت ہوتے وقت میں نے حرم مکہ کو اپنی کوششوں کی شروعات بنایا اور مجھے امید ہے کہ میں اس داعی اعظمؐ کے شہر سے روز قیامت اٹھوں گی، ہجرت تو طریق نبویؐ ہے! یہ تو سنتِ رسولؐ ہے! مجھے معلوم ہے رستہ کٹھن ہے، مگر میں یہ سودا طے کر آئی ہوں!!

☆☆☆